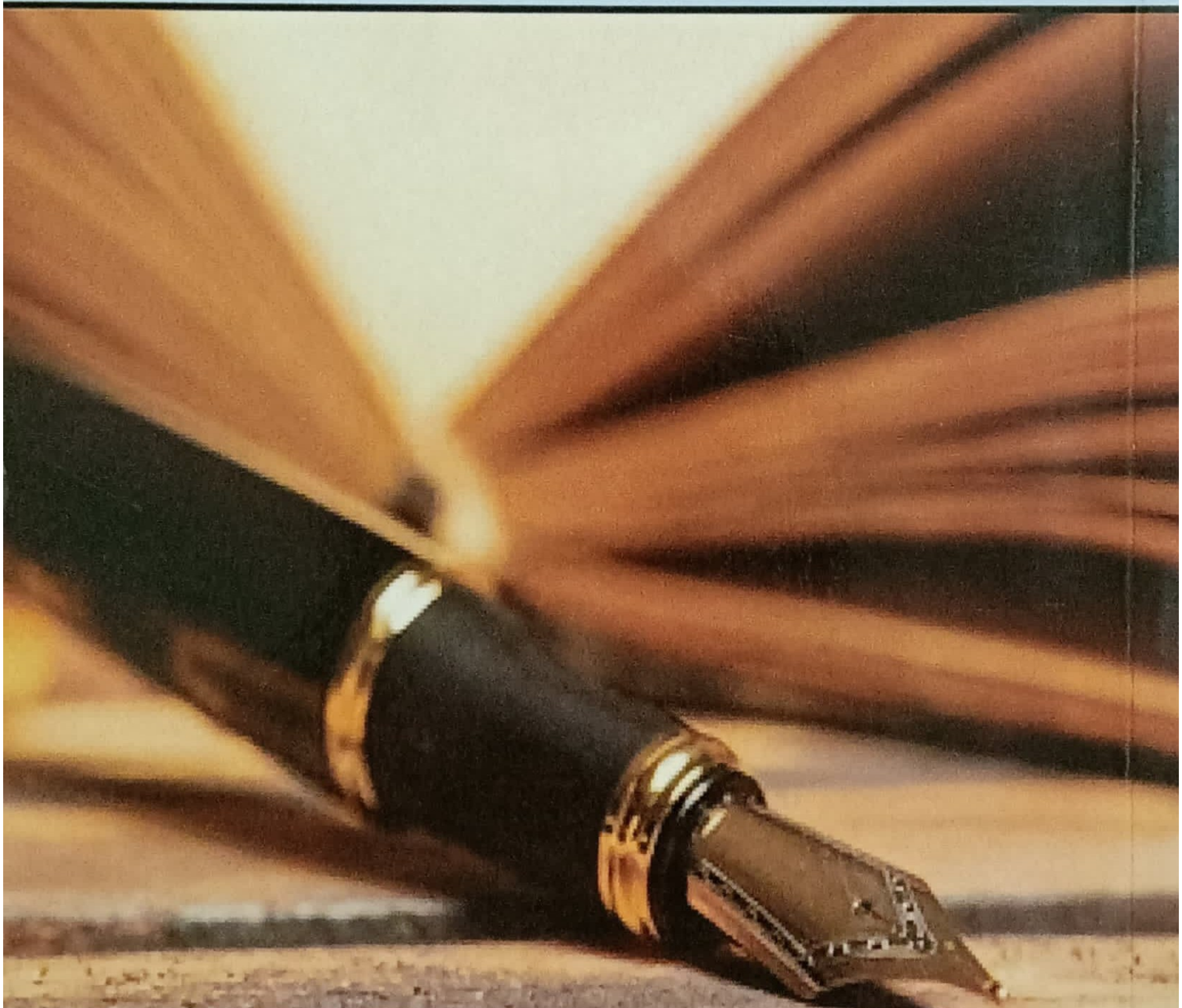
شیخ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی

حیات و مکتوبات



محمد عرفات اعجاز اعظمی

شیخ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی

حیات و مکتوبات

محمد عـــرفات اعجاز اعظمی

بسم الله الرحمن الرحيم

شیخ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی

[۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء ـــــــ ۱۱۷۸ھ/ ۱۷۶۴ء]

حیات ومکتوبات

محمد عرفات اعجاز اعظمی

ناشر

مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری

شیخ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی
حیات و مکتوبات

محمد عرفات اعجاز اعظمی

صفحات : ۱۸۴
طبعِ اول : ۲۰۲۳ء
قیمت : ۲۰۰
ناشر : مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری

Shaikh Abulgaus Garam Deewan Bhirvi
Hayat o Maktoobat
By: Mohammad Arfat Ejaz Azmi

Maulana Ejaz Ahmad Azmi Library
Email: arfatazmi89@gmail.com
Mob: 9936029463
Year of Edition: 2023
Pages: 184 - Rs 200

ISBN:
Printed by: Markazi Publications

ملنے کا پتا
مکتبہ ضیاء الکتب محلہ اتراری خیرآباد ضلع مئو 9235327576
مولانا معاذ احمد صاحب محلہ پچھم بھیرا 9236888055

والد گرامی قدر

مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ

کی نذر

◆ ◆ ◆

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

تجھ کو مثل طفلک بے دست و پا روتا ہوں میں
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہوں میں

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

علامہ محمد اقبال

فہرست

شیخ ابوالغوث گرم دیوان: حیات و مکتوبات

۱- آباواجداد

۵- سلطان پور بھیرا سے وحدت آباد لہرا -۸۵

۶- قیام وحدت آباد لہرا کے چند واقعات

۷- وحدت آباد لہرا سے غازی پور

۸- آخری ایام

۹- اولاد و خلفا

۱۰- تعارف ''البدائع'' -۱۲۸

۱۱- شیخ ابو الغوث گرم دیوان کے تذکروں کا تجزیاتی مطالعہ

۱۲- مکاتیب -۱۴۶

پیش گفتار

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی دار المصنّفین اعظم گڑھ

دیار پورب کے اضلاع میں اعظم گڑھ کے قصبات و مواضعات کو بجا طور پر یونان و شیراز سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے۔ بلا شبہ اعظم گڑھ اور خطہ پورب کی متعدد بستیاں اپنے عہد شباب میں علوم و فنون کا مرکز اور لعل و گہر کا مخزن تھیں۔ ایک عہد اور ایک زمانہ گذر جانے اور ماضی کی داستانوں کے دفن ہو جانے کے بعد بھی ان قریات کے ذروں کی تابانی اور ان کے ابر کی گہر باری کا ذکر گاہے ماہے آ ہی جاتا ہے اور حوصلہ مندوں کو نئی بلندیوں کے لیے نئے خواب دے جاتا ہے۔

یہ مواضع اپنی تاریخ و تہذیب اور اعلام و اشخاص کے تابندہ کارناموں کی ایک روشن تاریخ کے ساتھ علم و فن اور فکر و عمل کا بڑا قیمتی سرمایہ بھی رکھتے ہیں اور ان سے طلوع ہونے والی روشنی کا دائرہ بھی ایک بڑے دائرے کو محیط ہے۔

اعظم گڑھ کے مواضعات میں ایک ایسی ہی نورانی بستی سلطان پور بھیرا ہے جس کی تاریخ بڑی روشن ہے اور جس کی خاک سے بے شمار اہل علم و فضل اور ارباب کمال اٹھے، جن کی ضیا پاشیوں نے ایک عالم کو منور کیا اور ان کے وجود کو زندگی و تابندگی بخشی۔ انھیں روشن چراغوں میں ایک سراجِ منیر اور سلسلۂ چشتیہ و سہروردیہ کے نامور بزرگ شاہ ابوالغوث گرم دیوان [۱۱۰۰-۱۱۷۸ھ] کی ذات گرامی بھی ہے۔

شاہ صاحب اپنے علم و عمل، فضل و کمال اور سلوک و معرفت میں یگانہ روزگار تھے۔ ان سے ایک بڑے حلقے کو فیض پہنچا اور ایک عرصے تک ان کی فیض بخشیوں کا سلسلہ قائم رہا اور بے شمار

تشنگانِ علم وعمل نے اپنی تشنگی بجھائی اور سیراب ہوئے۔ان کے تلامذہ اور اخلاف کی مساعیِ جمیلہ سے اس خطۂ مشرق میں اسلام کی روشنی پھیلی اور ایک جہان نے فیض پایا اور اس سلسلہ کی فرحت بخش ہواؤں سے متمتع ہوتا رہا۔

شاہ ابوالغوث گرم دیوان اور ان کا خانوادہ علم وعمل کا ایک بڑا خدمت گذار خانوادہ تھا۔ نہ صرف ان کے والد اور جد امجد نے علوم دینیہ کی خدمت میں زندگی بسر کی بلکہ ان کے صاحب زادوں بالخصوص مولانا حافظ محمد اسحاق محدث لہراوی نے بھی قرآن وحدیث کی خدمت میں زندگی گذاری۔گویا ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کے مصداق تھا۔

مولانا شاہ ابوسعید ابوالخیر اور صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری اور بہت سے اربابِ کمال بھیرا کی خاک سے اٹھے اور صفحہ دہر میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا۔اس خانوادے کی گل سرسبد مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان تھے جو تحصیل وتکمیل کے بعد وحدت آبادلہرا کو رشد وہدایت کا مرکز اور اپنا مسکن بنایا۔ان کی خانقاہ کے آثار اور مزار بھی لہراہی میں ہیں۔

موضع بھیرا ولہرا اور بعض دوسرے مواضعات کی تاریخ میں اس خانوادۂ فاروقی نے ان کے نظم وانتظام کے علاوہ رشد وہدایت کا جو سلسلہ قائم کیا اور جن کی بدولت بے شمار نفوس کے تزکیہ کا بابرکت فریضہ ادا ہوا، وہ دیار پورب کی تاریخ وتہذیب کا بڑا شان دار باب ہے۔اس لیے ضرورت تھی کہ حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان کی سیرت وشخصیت ،علم وحلم،فکر وعمل اور رشد و ہدایت کی سچی داستان تفصیل سے قلم بند کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ کس درجہ بلند اور عالی رتبہ شخص تھے اور ان کی بدولت علم وعمل کے کیسے کیسے چشمے پھوٹے اور ان سے کس قدر لوگوں نے اپنی پیاس بجھائی۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کا تذکرہ اگرچہ مختلف کتب ورسائل میں اختصار سے سہی موجود ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی عظمت و بلندی اور علوے کمال وقبولیت کے لحاظ سے ایک وقیع اور قابل ذکر مقالہ کی ضرورت تھی،جس میں دکھایا جائے کہ ان کی شخصیت کس درجہ بلند رتبہ تھی، وہ کس پایہ کے عالم وفاضل اور عامل ومرشد تھے،ان سے دین وملت کو کس قدر فیض پہنچا اور ان کے احوال وآثار کیا ہیں۔

حضرت شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی سیرت وشخصیت کا تحقیقی مطالعہ اوران کی سوانح کے دستیاب لیکن منتشر ماخذ سے ان کی شخصیت اور علم وعمل کی مرقع آرائی ایک مشکل کام تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے ایک عالم و فاضل اور محقق ومصنف کے ساتھ عالی حوصلہ اہل قلم کی ضرورت تھی، تاکہ وہ موضوع کا حق کما حقہ ادا کر سکے۔

عزیز گرامی مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی سلمہ کو اللہ تعالیٰ نے ان اوصاف و امتیازات سے سرفراز کیا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع وعمیق ہے، وہ جو یاے علم وتحقیق تو ہیں ہی، تلاش وتفحص اور خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو میں نئی نسل کے وہ ایک ممتاز اہل قلم ہیں۔ علمی وتحقیقی کام کرنا اور ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرنا اور موضوعِ تحقیق وتصنیف سے صد فی صد انصاف کرنے کا عزم ان کی ذاتی خوبیاں اور تصنیفی اوصاف ہیں۔ وہ تصنیف وتالیف کے فن سے بخوبی آشنا ہیں۔ ایک فاضل و یگانہ عالم دین حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ صاحب کی اولاد ہونے کے باوصف وہ بلند اخلاق اور عالی حوصلہ جذبات واحساسات کے حامل ہیں۔ سنجیدگی، متانت و دیانت ان کے دیگر اوصاف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس موضوع کو نبھانے میں کامیاب رہے اور بڑا شاندار تحقیقی اور سوانحی مقالہ لکھا ہے۔

اس مقالہ میں انھوں نے تحقیق وتنقید کا بڑا خیال رکھا ہے اور بڑی خوبی سے حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے حالات و واقعات، سیرت وشخصیت اور فضل وکمال کی مرقع آرائی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے بڑی عرق ریزی سے یہ سوانح عمری تیار کی ہے۔ مختلف فصول و ابواب میں شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے آباواجداد، والدین، ولادت، بچپن، تعلیم وتربیت، بیعت و خلافت، نکاح، اہلیہ واولاد، سلطان پور بھیرا سے وحدت آباد لہرا تک بود وباش کے تمام واقعات، الہ آباد میں مرشد کی خدمت۔ لہرا سے الہ آباد، عقد ثانی، بعض اہل علم وکمال سے شرفِ ملاقات وغیرہ کی تمام تفصیلات سپرد قلم کی ہیں۔

علاوہ ازیں آخری دور کے ان کے حالات و واقعات، غازی پور کا رخ، آخری ایام اور اولاد واحفاد کے ذکر کے ساتھ ان کی تصنیف البدائع کا تعارف بھی شامل ہے۔ اس کتاب سے پہلے شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے تذکرہ وسوانح پر جو تحریریں شائع ہوئی ہیں، ان کا جائزہ بھی لائق

مصنف نے پیش کیا ہے۔ ان کے مشاہیر تلامذہ کا تذکرہ بھی مصنف نے لکھا ہے۔ آخر میں حضرت شیخ کے مکتوبات کو بھی شامل کیا ہے۔ اس طرح شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے حالات وسوانح اور کارناموں پر ایک قیمتی دستاویز تیار ہوگئی ہے۔

فاضل مصنف مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی کا اسلوب نگارش سادہ وشگفتہ اور دل کش ہے۔ انھوں نے نہ صرف زبان وبیان کا خاص خیال رکھا ہے، بلکہ حوالوں کا بھی پوری طرح اہتمام کیا ہے اور جو بات جہاں سے اخذ کی ہے، اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہی نہیں، حضرت شیخ کے حالات اور شخصیت پر جو مضامین ومقالات یا جو تحریریں لکھی گئی ہیں، ان کا تعارف وتجزیہ بھی پیش کیا ہے اور ان میں جو اغلاط وابہام در آئے تھے، جدید مآخذ سے ان کی تحقیق وتصحیح بھی کی ہے۔ اس سے حضرت شیخ کے احوال وآثار کا ایک عمدہ مرقع سامنے آجاتا ہے۔

بلامبالغہ اپنے موضوع پر یہ ایک عمدہ اور معرکۃ الآرا تحقیقی کاوش ہے۔ اس قدر محنت اور سلیقہ مندی سے کتاب لکھنے کے لیے فاضل مصنف قابل صد مبارک باد اور اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی فاضل مصنف کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے اور اسے لوگوں کے لیے مفید بنائے۔ آمین

ناچیز
محمد الیاس الاعظمی
مدیر: ادبی دائرہ۔ اعظم گڑھ
۱۷- فروری ۲۰۲۳ء

تقریب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
صدر المدرسین مدرسہ تحفیظ القرآن سکھٹی مبارک پور

آج سے دوسو سال پہلے تک ہندستان پر اسلامی عظمت کا پھریرا لہراتا تھا۔ مسلم سلاطین کے عہد زریں میں ہندستان نہ صرف امن وامان کا مرکز تھا، بلکہ اس کی دولت وثروت اور خوش حالی کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجتا تھا۔ دنیا کے دوسرے ممالک سے ہزاروں افراد ہندستان میں بود وباش اختیار کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ یہ لوگ یہاں کے حکم رانوں کی انصاف پسندی، عدل گستری اور عوام الناس کی بے لوث خدمت گزاری کا حال سن کر اور اس ملک کو گہوارۂ عدل وامن سمجھ کر آتے اور یہیں کی وطنیت اختیار کر لیتے تھے۔ شاہانِ مغل کی علم دوستی اور علما پروری کے قصے زبان زد عوام وخواص تھے، جب کہ شمالی ہند میں دیارِ پورب کے خطۂ جون پور میں سلاطین شرقیہ کی کرم گستری، علم دوستی وفن پروری، علما نوازی اور صوفیا وصالحین سے والہانہ عقیدت اور ان کی خانقاہوں وتربیت گاہوں میں فدویانہ حاضری کا شہرہ ہر چہار اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔ اس دور میں ہزاروں علما وصلحا اور صوفیا واتقیا نے بیرون ملک شام، عراق، ایران، ترکستان اور خراسان سے آکر سرزمین ہند میں اصلاح وتربیت کے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہ خاموشی سے آتے اور کسی بستی، قصبہ یا گاؤں میں رؤوسائے مملکت اور وزرائے سلطنت کی عطا کردہ زمین پر یا خود خرید کردہ قطعۂ اراضی پر کوئی خانقاہ یا مدرسہ قائم کرتے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے۔ خلقِ خدا کا ان کی طرف رجوع ہوتا تو علوم ومعارف کے سرچشمے جاری ہوجاتے اور سلوک وطریقت اور تزکیۂ نفس کی باد بہاری چلنے لگتی۔ اس طرح پورا کا پورا علاقہ اور خطہ ان سے فیض یاب ہوتا۔

دیارِ پورب کے نہ جانے کتنے گاؤں، قصبات اور دیہات ہیں، جو ایک عہد اور زمانہ

میں اولیاے مصلحین اور علماے راسخین کی جلوہ گاہ تھے۔لیکن زمانے کی ناقدری اور تاریخ کی ستم ظریفی کہ اخلاص وللّٰہیت کے پیکر اِن بزرگوں کی دینی واصلاحی خدمات کو اس نے محفوظ نہیں رکھا، اس لیے ان کی اصلاحی سرگرمیوں کے نقوش تاریخ کے صفحات پر بہت کم نظر آتے ہیں، خال خال کہیں ان کے بکھرے ہوئے تذکرے مل جاتے ہیں۔

انھیں قدیم بستیوں میں دیار پورب کا معروف گاؤں بھیرا ولید پور بھی ہے، جو اپنے محل وقوع کے اعتبار سے نہایت سرسبز وشاداب قطعۂ ارضی پر بسایا گیا ہے۔ میرے وطن اترا ری خیرآباد سے جانب شمال بہ مشکل تمام ایک میل کے فاصلہ پر ٹونس ندی کے اس پار بھیرا آباد ہے، جس کی ایک طویل تاریخ ہے۔جس طرح باغوں اور درختوں کی کثرت کی وجہ سے یہ ایک سرسبز وشاداب اور زرخیز سرزمین ہے، اسی طرح اپنے اصحابِ علم وفضل اور نام ور فرزندوں کی وجہ سے مردم خیز بھی ہے۔ اس کی خاک میں علوم وفنون اور سلوک وطریقت کے ایک سے ایک گنج ہاے گراں مایہ آرام فرما رہے ہیں۔کبھی یہ سرزمین اپنے وقت کے بڑے بڑے قطب وابدال کی آماج گاہ تھی، کسی دور میں یہاں عدل وانصاف کی بزم کے شہرۂ آفاق جج اور آسمانِ منطق وفلسفہ کے درخشاں آفتاب و ماہتاب پائے جاتے تھے۔ انھیں نامور ہستیوں میں ایک عظیم شخصیت شاہ ابوالغوث گرم دیوان علیہ الرحمہ کی بھی تھی۔

شاہ ابوالغوث گرم دیوان ان نفوس قدسیہ میں سے تھے جن کے فیوض وبرکات سے سرزمین بھیرا وولید پور اور اطراف وجوانب کی بستیوں نے بہ قدر استطاعت خوب نفع اور فیض اٹھایا۔تعلیم وتربیت کے ساتھ تزکیۂ قلوب اور اصلاحِ نفوس کی دولت بھی ڈھیروں ڈھیروں ان کے ہاتھوں بٹی۔ اللہ تعالی نے گرم دیوان شاہ کو شریعت وطریقت کا جامع بنایا تھا۔وہ ایک جید الاستعداد عالم تھے، حدیث وتفسیر، فقہ وفتوی،نحو وصرف اور ادب وبلاغت سب میں ان کو درک حاصل تھا۔ان کا شمار اپنے وقت کے مشاہیر علما میں ہوتا تھا۔سلوک وطریقت ان کا خاص میدان تھا،تصوف کے چاروں سلسلوں میں ان کو بلند مقام حاصل تھا۔سلوک واحسان تو ان کی دلچسپی اور عملی سرگرمی کا خاص موضوع تھا، رہروانِ رشد وہدایت ان کی نگرانی وتربیت میں ترقیات کے منازل طے کرتے تھے، ان کی کشش اور محبت بڑے بڑے امرا اور رؤسا کو کھینچ کر ان کے

آستانے تک لائی۔مگر افسوس کہ ایسی بلند پایہ علمی وروحانی شخصیت کی سیرت وسوانح پر اب تک کوئی دستاویزی کام نہیں ہو پایا تھا۔اس سلسلہ میں ایک نمایاں کاوش مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی ہے، انھوں نے اپنی کتاب ''دیارِ پورب میں علم اور علما'' میں چالیس صفحات میں گرم دیوان شاہ کا تذکرہ لکھا ہے، اس کے علاوہ اتنا تفصیلی تذکرہ اب تک میری نگاہ سے نہیں گزرا ہے، بلکہ جن لوگوں نے قاضی صاحب کے بعد کچھ لکھا ہے، وہ سب کے سب انھیں کے مکمل طور پر خوشہ چیں رہے ہیں۔

رب کریم جزائے خیر دے عزیزی مولانا محمد عرفات سلمہ کو، انھوں نے سالوں کی محنت کے بعد شاہ ابوالغوث کے سوانحی حالات پر بڑا قابل قدر اور دستاویزی کام کر دیا۔چند سال پہلے انھوں نے خبر دی تھی کہ وہ گرم دیوان شاہ کے حالات وتذکرہ پر لکھی گئی فارسی کتاب ''مناقبِ غوثی'' کا ترجمہ کر رہے ہیں، انھوں نے ترجمہ کی تکمیل کے بعد مجھے بھیجا بھی۔اس ترجمہ کی تکمیل کے بعد وہ ان کے مزید آثار وباقیات کی تلاش وجستجو میں نکل پڑے اور جویندہ یابندہ کے مصداق تلاش و جستجو کے اس سفر میں بہت ساری چیزیں ان کے ہاتھ آئیں، جن میں بعض تک قاضی اطہر صاحب کی بھی رسائی نہ ہو سکی تھی۔پھر انھیں خیال آیا کہ مناقبِ غوثی کی اشاعت کے بجائے ان سب معلومات کی روشنی میں ایک جامع سوانح ترتیب دینی چاہیے، تو وہ اس میں جٹ گئے اور کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد پونے دوسو صفحات پر مشتمل یہ سوانح تیار کر دی۔

اس سوانح میں قاضی صاحب کے مضمون پر جو اضافات ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱- اس میں شاہ ابوالغوث کے آباواجداد بالخصوص ان کے والدین اور اولادوں کا تذکرہ بہت تفصیل سے مرتب انداز میں کیا گیا ہے۔

۲- ان کے بعض خلفا کا بہت تحقیق وتفصیل کے ساتھ ذکر اس میں ہے، جب کہ قاضی صاحب کے تذکرہ میں ان کا نہایت اجمالی اور سرسری ذکر ہے۔

۳- تعلیم وتربیت کے باب میں بھی بہت سی تفصیلات ہیں۔

۴- شاہ صاحب کے چودہ مکاتیب کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا۔یہ مکاتیب تصوف وسلوک کے بڑے اہم مباحث پر مشتمل ہیں۔

۵- اس میں کئی اسفار کا اضافہ ہے۔
۶- شاہ صاحب کے قیام لہرا اور غازی پور کی معلومات بہت تحقیق اور تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں۔
۷- شاہ صاحب کی تصنیف ''البدائع'' کا تعارف بھی شامل کیا گیا ہے۔ البدائع کا ذکر ان کے کسی تذکرہ نگار نہیں کیا ہے۔
۸- ایک مستقل باب شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے تذکروں کا تجزیاتی مطالعہ ہے، جس میں ان کے اردو و فارسی تذکروں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی علمی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کا ایک اہم باب ہے۔

مصنف کا دیباچہ اور معروضات بہت اہم ہیں، کتاب سے پہلے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے، اس سے مصنف کے طریقۂ کار اور ان کی محنت و کاوش کا اندازہ ہوگا۔ کتاب ۱۳- ابواب پر مشتمل ہے:

[۱] آباواجداد، [۲] والدین، [۳] ولادت، بچپن اور تعلیم، [۴] بیعت وخلافت، [۵] نکاح، اہلیہ اور اولاد، [۶] سلطان پور بھیرا سے وحدت آباد لہرا تک، [۷] قیام وحدت آباد لہرا کے چند واقعات، [۸] وحدت آباد لہرا سے غازی پور، [۹] آخری ایام، [۱۰] اولاد و خلفا، [۱۱] تعارف البدائع، [۱۲] شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے تذکروں کا تجزیاتی مطالعہ، [۱۳] مکاتیب۔

ان ابواب کے تحت اپنے امکان بھر صاحبِ سوانح کی حیات اور علمی و روحانی کمالات کا احاطہ کرنے کی بھر پور کوشش کی گئی ہے۔ ابھی یہ نقشِ اول ہے، خود مصنف کو اس کا احساس ہے کہ کئی ایک اہم مآخذ تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی، ورنہ اسے مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا نقشِ ثانی نقشِ اول سے بہتر اور خوب تر ہوگا:

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول

اللہ تعالیٰ مصنف کی اس کاوش کو قبولِ عام کی دولت سے نوازے اور ان کے علم و عمل اور ذہن و قلم میں خوب برکت عطا فرمائے۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی
۱۹ جمادی الاولیٰ ھ مطابق ۱۴ دسمبر چہارشنبہ

تقدیم

مولانا مفتی منظور احمد قاسمی بھیروی
استاذ حدیث وفقہ جامعہ عزیزیہ سہریا نظام آباد

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم! امابعد

یہ حقیقت ہے کہ مذہبِ اسلام ایک ابرِ کرم ہے، عرب کی فضاؤں سے جس کی گھٹا اٹھی اور چہار دانگ عالم میں پھیلتی چلی گئی۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ یہ ابرِ کرم ربعِ مسکون کے ایک ایک چپہ پر برسا، روے زمین کے ہر گوشے میں بوندیں برسائیں۔ یہ سلسلہ درازتر اور وسیع تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ ہندستان میں دیارِ پورب کی ایک چھوٹی سی بستی بھیرا (قدیم نام آستانہ بھیرا، ابتدائی نام سلطان پور) کی سرزمین بھی اس کی پھواروں سے زرخیز، سرسبز وشاداب اور چمن زار ہونے سے محروم نہیں رہی۔ اسی ابرِ کرم کی چھینٹوں کی برکت ہے کہ یہ معمولی سی آبادی اپنی آفرینش ہی سے علم ریز، ہدایت خیز اور گہوارۂ علم وفن بنی ہوئی ہے۔ اس وادیِ علم افروز کے افق سے عرفان ومعرفت، زہد وعبادت، شریعت وطریقت، علوم وفنون کے بہتیرے آفتاب وماہتاب طلوع ہوئے اور عالم کو روشنی بخشی۔ اس ہدایت خیز زمین میں متعدد آب دار موتی اور قیمتی لعل وگہر پروان چڑھے اور اپنے وجودِ بافیض سے قرب وجوار کے قصبات وقریات کو بقعہ نور بنائے رکھا۔ اس گہوارے میں علم وفن کے ماہرین، شعروادب کے شائقین، کبار علما وصلحا، زہاد ومتصوفین، محدثین ومفسرین، منطقی وفلسفی، وکیل وجج، روحانی مشائخ اور عبقری شخصیات پلیں، بڑھیں، جوان ہوئیں اور آسمانِ شہرت پر چمکیں اور تاحیات قوم وملت کی علمی وروحانی، دینی وشرعی، قومی وملی رہنمائی کا دینی فریضہ انجام دینے کے لیے علم ومعرفت کا دریا بہاتی رہیں، رشد وہدایت کا چراغ روشن کرتی رہیں اور

ادب وتحقیق کی انجمن جمائے رکھیں۔

بلاشبہ بھیرا گاؤں آباد ہوئے صدیوں سال ہوئے، اس گاؤں کی تاریخ سیکڑوں سال پرانی ہے۔شیرازِ ہند جون پور کے مشہور علم دوست بادشاہ ابراہیم شاہ شرقی کے دورِ سلطنت میں مشرقی یوپی کا معروف علمی وروحانی فاروقی خانوادہ سب سے پہلے اس گاؤں میں فروکش ہوا۔اسی بابرکت خاندان کے وجودِ باسعادت سے یہ بستی پردۂ عدم سے ہستیِ وجود میں آئی اور آج تک آباد و شاداب ہے۔ عرصۂ دراز تک تسلسل کے ساتھ اس عرفانی خاندان میں صاحبِ فضل و کمال، ماہرینِ علم وفن پیدا ہوتے رہے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں پیہم اولیا واتقیا کا مولد ومسکن رہا، مدتوں ان کی اولاد دراولاد میں رشد وہدایت کا سلسلۂ زریں باقی رہا، چراغ سے چراغ جلتا رہا، اسلامی شان وشوکت قائم رہی، ان نفوس قدسیہ کی ایمان کی گرمی اور ایقان کی سوزش سے صدیوں چراغوں کی لو مدھم نہیں ہوئی، ان کے کمالِ باطن اور تزکیۂ نفوس سے خانقاہیں مرجعِ خلائق بنی رہیں، ان کے علم وفن اور فضل وہنر سے درس گاہیں عشاقِ علم اور شائقینِ فن سے معمور رہیں۔

الغرض اس گاؤں کی خاک کے ذروں سے صرف فاروقی خاندان میں نیر تاباں بننے والوں میں قطب وقت شیخ معروف، شاہ ابوسعید، شاہ ابوالخیر (’شیر وشکر‘ کے مصنف) مخدوم شاہ اسماعیل، ملامحمود بھیروی ثم جون پوری (فلسفہ کی مشہور زمانہ کتاب ’شمس بازغہ‘ کے مصنف) شاہ ابوالغوث گرم دیوان، شاہ ابواسحاق محدث (نورالعینین فی اثبات رفع الیدین کے مصنف) شاہ عبدالحق، شاہ محمد علی، مولانا شاہ علی احمد، شاہ محمد عثمان فدائی، چیف جسٹس سر شاہ محمد سلیمان، مولانا شاہ محمد عزیز، مولانا محمد اسلم وغیرہ جیسے صاحبِ فضل وکمال ہیں۔بھیرا کی زرخیزی اور خوش بختی کے لیے اتنا ہی زائد از کافی ہے کہ اس کے افق پر طلوع ہونے والے چندے آفتاب و چندے ماہتاب بنے، اس کے گہوارے میں پلنے والے بچوں میں کتنے ایسے ہیں کہ جب انھوں نے عنفوانِ شباب کی دہلیز پر قدم رکھا تو اساطینِ علم وفضل، مشائخِ ورع وتقوی، مشاہیرِ تصوف واحسان اور عباقرۂ وقت کی حیثیت سے امتِ مسلمہ میں ان کا آوازہ بلند ہوا اور مختلف علاقوں میں قدم رنجہ فرما کر اپنے کمالات وفضائل کی شعاؤں سے شبِ دیجور کی ظلمتوں کو کافور اور علاقے کو نور بخشا۔ اپنے زہد و تقوی کی قندیلوں سے لوگوں کے قلوب سے جہالت وضلالت کی تاریکیوں کو چھانٹ کر روشن و

منور کیا۔

بھیرا کی سرزمین پر فاروقی خاندان کے اس زریں سلسلے کی ایک بڑی ہی سنہری و آب دار کڑی شیخ ابوالغوث گرم دیوان شاہ فاروقی بھیروی کی ہے، بلکہ ان کی شخصیت امت میں بارہویں صدی ہجری کی مقبول و مشہور ترین اور فاروقی خانوادے میں سب سے زیادہ متعارف و بافیض شمار ہوتی ہے۔ یہ اپنے زمانے میں ایک طرف جید عالم تھے تو دوسری طرف راہِ طریقت کے راہ رو بھی تھے، علم و عمل کی جامعیت میں نابغۂ روزگار ہونے کے ساتھ زہد و تقوی اور جادۂ شریعت ان کا شعار تھا۔ علم و آگہی میں تفوق کی وجہ سے علمائے کبار میں شمار ہوتے تھے اور احسانی و روحانی سرگرمیوں کی وجہ سے مشائخِ عظام کی صف اول میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علم کی آب یاری کے لیے مدرسہ اور روحانیت کو پروان چڑھانے کے لیے خانقاہ دونوں ایک ساتھ آباد کیے ہوئے تھے۔ چوں کہ موصوف خود تصوف و سلوک کی راہ سے سلسلۂ عالیہ چشتیہ سہروردیہ سے منسلک تھے اور ان کا فاروقی خاندان جس سے ان کا نسبی تعلق تھا، مدتِ مدید سے طریقِ صوفیہ اور راہِ احسانی میں رشد و ہدایت کا چراغ جلائے تصفیۂ نفوس اور تزکیۂ قلوب کا مذہبی فریضہ انجام دے رہا تھا، فضل و کمال اور علم و عرفان کا یہ زریں سلسلہ ان کے آبا و اجداد میں نسل در نسل چلا آ رہا تھا تو پھر حفید موصوف کا ان انفاسِ قدسیہ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو کر روحانیت و مشیخت و طریقت کے بلند مقام پر فائز ہونا اور علوم و فنون میں اعلی مناصب کو سرکرنا، عظمت و رفعت کے مینار پر پہنچنا کیا مشکل تھا۔ چنانچہ عوام و خواص میں سے بے شمار افراد ان کے فیضِ صحبت سے جادۂ حق پر گام زن ہوئے۔

زیرِ نظر کتاب انھیں محبوبِ الٰہی شیخ ابوالغوث گرم دیوان فاروقی بھیروی کی سوانح حیات ہے۔ یہ بات محقق ہے کہ تاریخ نویسی و تذکرہ نگاری کی اصل، سوانحِ حیات لکھنے اور نقوشِ زندگی تحریر کرنے کی بنیاد قرآن میں موجود ہے۔ چنانچہ جا بہ جا قرآن میں انبیا و رسل کے ایمان افروز تذکرے مرقوم ہیں، اسی طرح امم سابقہ کے نصیحت آموز حالات و واقعات مذکور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ میں بھی یہ سنتِ حسنہ آج تک زندہ ہے۔ صحابہ سے لے کر موجودہ زمانے تک اپنے بزرگوں کے حالات محفوظ کر کے اور اسلاف میں خواص کے کارناموں کو قیدِ تحریر میں لا کر بعد والوں کو محظوظ کرنے کا محبوب فن جیلاً بعد جیلٍ چلا آ رہا ہے۔ اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے

کہ فنِ تاریخ و تذکرہ نے واقعاتِ گذشتہ اور ماضی کے حالات سے عبرت و موعظت کا فائدہ حاصل کرنے کا جذبہ و حوصلہ دیا ہے، نیز عظیم شخصیات کے محاسن، یگانۂ روزگار اعیان کے کارنامے، صاحبِ صلاح و فلاح مشاہیر کے نقوشِ حیات باعثِ سعادت و فضیلت ہونے کے ساتھ حیاتِ انسانی کے خطوط کو صحیح رخ تفویض کرنے میں نہایت معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صاحبِ ایمان و یقین بزرگ اور اللہ کے محبوب و مقبول بندوں کا تذکرہ مستقبل کی نسلوں میں باقی رہنا اللہ کی بڑی نعمت ہے۔

انھیں جذبات و خیالات کے زیر اثر پیش نظر کتاب میں اللہ کے ایک خاص الخاص صالح بندے کی زندگی کے نقوش قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ان کی پوری زندگی کے خط و خال اور کوائف و احوال سے پُر، سفر زیست کے حسن و جمال اور خلق و خصال سے لبریز، کمالاتِ علمی اور واقعاتِ روحانی پر مشتمل گراں قدر مرقع اور نمونہ کی زندگی کے لیے رہنما دستاویز ہے اور اس کے ساتھ اس کتاب میں کئی صدی کے ملکی و قومی احوال بھی نمایاں ہیں، مسلمانوں کی علمی، تمدنی، معاشرتی اور ثقافتی تصویریں بھی ہویدا ہیں۔

یہ سوانح حیات جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، استاذِ گرامی عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی بھیروی کے خلف رشید عزیزم مولانا محمد عرفات اعظمی بھیروی سلمہ کی تگ و دو، محنت شاقہ، عرق ریزی، جاں فشانی کا ثمرہ اور ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ عزیزم نے صاحبِ سوانح کے تعلق سے مختلف کتابوں اور مخطوطات کو متعدد کتب خانوں سے تلاش کر کے ان کی اوراق گردانی کی، اسفار کی صعوبتیں، بادیہ پیمائی کی مشکلات برداشت کیں، آبادیوں اور ویرانوں کے چکر کاٹے، ثقہ اور قابلِ اعتماد لوگوں سے ملاقات کر کے شاہ صاحب کے حالات و متعلقات کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں، غرض کہ جن دیہات و قصبات سے مفید مطلب باتیں معلوم ہونے کی ادنی سی توقع ہوئی، وہاں قدم پیمائی سے دریغ نہیں کیا، پھر اپنے اشہبِ قلم کو مہمیز کیا تو صورت و سیرت سے مزین، ظاہری و باطنی حسن و جمال سے آراستہ، مستند مآخذ و مصادر سے مرصع یہ سوانح حیات وجود پذیر ہو کر ہمارے ہاتھ اور بصارت کے حوالے ہوئی۔ لہٰذا یہ کتاب زبان و بیان کے اعتبار سے اور مواد کی جامعیت کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ اور لائقِ استفادہ ہے۔

یوں تو سرزمین بھیرا کی خاک کے پردے سے اٹھ کر آسمانِ دنیا پر چمکنے والی بہت سی ایسی عبقری شخصیات ہیں جو اپنے کثیر محاسن و مفاخر کی بہ دولت بجا طور پر اس کی مستحق تھیں کہ ان پر مستقل کتابیں تالیف کی جائیں، ان کی سوانح حیات سے عوام وخواص کو روشناس کرایا جائے، لیکن تقدیر الٰہی سے ایسا نہیں ہوسکا، جس کی وجہ سے وہ شخصیات گوشۂ خمول میں ایسا کھوئیں کہ چند تاریخی کتابوں میں ان کے ناموں کے سوا ان کے تفصیلی کارناموں کے بارے میں کچھ نہیں ملتا۔ اس حقیقت کا احساس عزیزم مولانا محمد عرفات سلمہ نے کیا اور ایک نادرۂ روزگار شخصیت کو گوشۂ گم نامی سے نکال کر دنیا کے سامنے ان کے نقوشِ زندگی اور کارناموں کو عیاں کرنے کا بیڑا اٹھایا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ہفت خواں عمل اہل علم کے ذمہ قرض تھا، موصوف نے سب کی طرف سے اس قرض کو چکایا اور کامیابی ان کے ہم رکاب و ہم قدم رہی۔

عزیزم ایک نوجوان فاضل، جواں سال جید عالم دین ہیں، پختہ قلم کے دھنی، شستہ و شگفتہ زبان کے شہ سوار، سلیس و عام فہم نگارش کے مالک ہیں، قلم رواں دواں مگر تحریر میں متانت و وقار کا عنصر عیاں، تدریسی مشاغل کے ساتھ علم و ادب، تحقیق و تالیف کے وسیع و مشکل میدان میں آبلہ پائی کو بھی اپنا محبوب مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر متعدد مقالات و مضامین ان کے گہر بار قلم سے منصۂ شہود پر وجود پا کر خراجِ تحسین کا تمغہ، حسنِ قبول کا درجہ اور سندِ اعتبار کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔

موصوف مولف اہل علم و قلم کی طرف سے عموماً اور بھیرا گاؤں کے ہر فرد کی طرف سے خصوصاً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ان کی اس لائق و فائق خدمت کو شرف قبول عطا کرے اور مزید علمی خدمتوں کی توفیق ارزانی بخشے۔ آمین یا رب العالمین

منظور احمد قاسمی بھیری

خادم حدیث وفقہ جامعہ عزیزیہ سہریا، نظام آباد اعظم گڑھ

۳- ربیع الثانی ۱۴۴۴ھ

معروضات

مارچ ۲۰۲۰ء میں جب پورے ملک کو معطل کر دیا گیا، ایک غیر مرئی جرثومے کی وجہ سے پوری دنیا ایک وسیع قید خانے میں تبدیل کر دی گئی تو طویل مدت کے لیے ہر شخص کی معمول کی زندگی تھم اور رک سی گئی۔ اس وقت ہر ذہن میں سوال تھا کہ ان خالی اوقات میں کیا کیا جائے اور کون سی سرگرمی اپنائی جائے۔ لوگوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سوال کی گتھی کو سلجھایا۔ کروڑوں لوگوں کی طرح میں بھی اس مسئلے سے دوچار ہوا، ذہن نے سجھایا کہ یہ بہترین موقع ہے ان کاموں کو پورا کرنے کا جو ایک مدت سے بہ وجوہ معرضِ التوا میں پڑے ہوئے ہیں یا قلتِ وقت کی وجہ سے ان کے کرنے کی رفتار بہت سست ہے۔ ان کاموں میں سے ایک کام 'مناقبِ غوثی' کا ترجمہ بھی تھا جس کی ابتدا ۲۰۱۸ء میں کی گئی تھی، مگر رفتار اس قدر سست تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ اس میں اتنا تخلف واقع ہوتا رہا کہ صرف مقدمہ اور ابتدا کے ایک دو باب کا ترجمہ ہو سکا تھا۔ ناکہ بندی کے بعد وافر مقدار میں وقت ملا تو ترجیحی طور ترجمہ کا کام شروع کیا اور ایک معمول بنا کر اسے مکمل کیا۔

ترجمہ کی تکمیل کے بعد شیخ ابوالغوث کے آثار و باقیات کی زیارت و تلاش کی جستجو پیدا ہوئی۔ پہلے لہرا ان کی قبر پر حاضری دی۔ وہاں ایک صاحب نے شیخ ابوالغوث کی تصنیف 'البدائع' کا ترجمہ دیا۔ اِس کتاب نے ان کی حیات سے متعلق کئی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھایا۔ اس کے بعد دھاوا غازی پور گیا جہاں شیخ کے اہل خاندان کی قبریں ہیں اور جہاں باقاعدگی سے شیخ کا سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔ غازی پور میں 'تذکرہ مشائخ غازی پور' کے مولف عبیدالرحمان صدیقی صاحب سے بھی نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان سے شیخ ابوالغوث سے متعلق گفتگو ہوئی تو کئی گرہیں کھلیں

اور نامعلوم چیزوں کا علم ہوا۔ خاص طور سے شیخ ابولغوث کے موجود اور قریبی مرحومین اہل خاندان کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔

اس کے بعد کتابوں کی گرد جھاڑنی شروع کی اور شیخ کے تذکروں کی تلاش کے لیے کمر بستہ ہوا۔ بہت سی کتابوں کو کھنگالا اور جہاں تک رسائی ہوسکی، ان کتابوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی جن میں شیخ ابوالغوث کا تذکرہ ہے۔ ارادہ تھا کہ شیخ اور ان کے اجداد کے بارے میں دستیاب معلومات حاصل کرنے کے بعد ضروری حوالے وحواشی لکھ کر ترجمہ شائع کر دیا جائے گا، مگر جیسے جیسے کام آگے بڑھتا گیا اور چیزیں ملتی گئیں، ویسے ویسے ترجمے کے اشاعت کے خیال میں تبدیلی آتی گئی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مناقبِ غوثی میں القاب وآداب، فارسی اشعار اور غیر متعلق باتوں کی بھرمار ہے۔ اگر ترجمہ من وعن شائع کر دیا جائے تو وہ ایک غیر دلچسپ کتاب ہوگی۔ اور پھر شیخ ابوالغوث اور ان کے اجداد کے بارے میں دورانِ جستجو بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوا جن سے مناقبِ غوثی کے صفحات خالی تھے اور ان معلومات کو حواشی میں نقل کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ اس لیے شدت کے ساتھ یہ خیال آنا شروع ہوا کہ ترجمہ کی اشاعت ابھی ملتوی کر کے مناقبِ غوثی کو بنیادی ماخذ بنا کر شیخ ابوالغوث کی تفصیلی سوانح حیات مرتب کر دی جائے جس میں ان سے اور ان کے اجداد سے متعلق ساری معلومات کو سلیقے سے جمع کر دیا جائے۔ رہا ترجمہ تو اسے کسی اور مناسب موقع سے شائع کر دیا جائے گا۔

یہ کتاب اسی خیال کی تجسیم وتعبیر ہے۔ اس کتاب کی بنیاد مناقبِ غوثی کی فراہم کردہ معلومات پر رکھی گئی اور اس کے ساتھ بہت سے دیگر مراجع وماٰخذ سے بھی استفادہ کیا گیا جن کے نام آپ کتابیات میں دیکھ سکتے ہیں۔ مناقبِ غوثی کی فراہم کردہ ساری معلومات نہیں لی گئی ہیں بلکہ اس میں بھی روایت ودرایت کا خیال رکھا گیا اور رطب ویابس کو ترک کر دیا گیا ہے۔

حوالے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یعنی جو بات جہاں سے لی گئی ہے، اس کی پوری تفصیل حاشیہ میں درج کر دی گئی ہے۔ متن میں مذکور غیر معروف یا کم مشہور افراد واشخاص کا ضروری تعارف بھی حاشیہ میں لکھ دیا گیا ہے۔ معروف ومشہور اشخاص کا تعارف لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ ان کا تذکرہ عموماً آسانی سے مل جاتا ہے۔

یہ کتاب شیخ ابوالغوث کی پہلی تفصیلی مطبوعہ سوانح ہے جو ان کی زندگی کے اکثر گوشوں پر ناقص ہی سہی مگر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ نقشِ اول ہے، اس لیے اس میں کمی وکوتاہی کا امکان زیادہ ہے اور پھر ہماری نارسائی بھی اس میں درآنے والی خامیوں کی ذمہ دار ہے کہ ایک دو بنیادی قلمی کتابیں ایسی ہیں جو تلاش کے باوصف ہماری رسائی سے باہر ہیں۔ اگر وہ کتابیں مل جاتیں تو بہت سی ناپختہ باتوں میں پختگی آجاتی اور کئی ایک شبہات کی تصدیق یا تردید ہوجاتی۔

دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے ذمہ داران اور کارکنان کا میں صمیم قلب سے شکرگزار ہوں، خاص طور مولانا حافظ عمیر الصدیق ندوی صاحب کا کہ ان کی وجہ سے مناقب غوثی سے استفادہ آسان ہوگیا۔ اللہ ان کے لیے ہر موقع پر آسانیاں پیدا فرمائے۔

اس کتاب کے معرضِ وجود میں آنے میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب کی تشجیع وتشویق کا بنیادی کردار ہے۔ انھیں کی حوصلہ افزائی اور ترغیب کی وجہ سے یہ مرحلۂ شوق طے ہوا۔ کتاب کی تکمیل کے بعد ان سے کتاب پر لکھنے کی درخواست کی تو محض حوصلہ افزائی کے لیے اپنی خراب صحت اور مسلسل تکلیف سے صرف نظر کر کے ایک عمدہ اور حوصلہ بخش تحریر لکھ دی۔

استاذ محترم مولانا ومفتی منظور احمد قاسمی صاحب کا خاص طور سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر کتاب کو از اول تا آخر دیکھا، بعض نادرستی کی نشان دہی کی اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنی قیمتی تحریر سے نوازا جو میرے اور کتاب دونوں کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ استاذ محترم مولانا ضیاء الحق خیرآبادی صاحب کے لیے سراپا سپاس ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو عزت بخشی اور ایک حوصلہ افزا اور عمدہ تحریر سے نوازا۔ مولانا صبیح الحسن قاسمی کا بے حد شکرگزار ہوں کہ انھوں نے بڑی محنت سے کتاب کا پروف دیکھا اور حتی الامکان کتابت کے اغلاط سے اسے پاک کرنے کی کوشش کی۔ مولانا شمس عالم قاسمی کا بھی شکریہ جن کا مخلصانہ تعاون ہر گام پر مجھے حاصل رہا۔

محمد عرفات اعجاز اعظمی

۲۶-ربیع الاول ۱۴۴۴ھ

۲۳-اکتوبر ۲۰۲۲ء

دیباچہ

صاحبِ تذکرہ شیخ ابوالغوث گرم دیوان کا مسقط الراس دیار پورب کا ایک مردم خیز گاؤں بھیرا ولید پور ہے۔ بھیرا کی تاریخ سیکڑوں سال قدیم ہے، یہ گاؤں ہر زمانے میں علما، صلحا اور اتقیا کا مولد و مسکن رہا ہے۔ اس گاؤں کی بنیاد مشرقی یوپی کے مشہور و برگزیدہ فاروقی خانوادے کے ہاتھوں پڑی۔ ابتدا میں اس گاؤں کا نام سلطان پور تھا، پھر آستانہ بھیرا ہوا۔ آستانہ بھیرا غالباً اس زمانے میں نام رہا ہے جب یہاں فاروقی خانوادے کے علما و بزرگوں کی درس گاہیں اور خانقاہیں مرجعِ عوام و خواص تھیں۔ کیوں کہ اس زمانے کے عرف میں ایسی روحانی جگہوں کو آستانہ کے نام سے پکارا اور یاد کیا جاتا تھا۔ بعد میں مرورِ ایام سے آستانہ کا سابقہ بھی ختم ہو گیا اور صرف بھیرا بچا جو تا حال باقی ہے۔

بھیرا گاؤں کی آبادی کب شروع ہوئی، اس کے بارے میں یقینی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے، کیوں کہ اس سلسلے میں مستند تحریر یا پختہ شواہد نہیں ملتے۔ ہاں یہ طے ہے کہ بھیرا کی بنیاد ۸۱۱ھ مطابق ۱۴۰۸ء کے بعد پڑی ہے۔ جون پور میں شیخ محمد کے انتقال کے بعد ابراہیم شاہ شرقی نے ان کے صاحب زادے شیخ مشید اور شیخ وجیہ الدین کو محمد آباد پرگنہ میں بارہ گاؤں بہ طور جاگیر عطا کیے تھے۔ شیخ محمد کا سن وفات ۸۱۱ھ [۱۴۰۸ء] ہے۔ جس وقت جاگیر ملی تھی اس وقت بہ شکل آبادی بھیرا کا نام و نشان نہیں تھا۔ ولید پور کی آبادی اس وقت موجود تھی جو پرگنہ محمد آباد کے تحت تھی۔ شیخ مشید کو اپنی جاگیر کے انتظامات سے کچھ خاص دل چسپی نہیں تھی، ان کا میدان دوسرا تھا اور وہ اپنا بیشتر وقت ارشاد و تلقین میں بسر کرتے تھے۔ اس لیے جاگیر کا سارا انتظام ملازموں کے اعتماد پر چھوڑ رکھا تھا۔ اخیر عمر میں انھیں بعض ذرائع سے ملازموں کی بدعنوانی کا علم ہوا تو ان کے

دونوں بیٹے شیخ معروف اور شیخ علی ولید پور وارد ہوئے اور جاگیر کا انتظام شیخ علی نے اپنے ہاتھ میں لیا۔

قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے سرسری طور پر اتنا لکھا ہے:

''شیخ معروف اور شیخ علی قریہ ولید پور کے قریب سلطان پور کے نام سے ایک بستی آباد کر کے اس میں سکونت پذیر ہوئے۔''[۱]

لیکن یہ بستی کس سن میں بسائی گئی، اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا اور نہ اس کی تعیین ہو سکی کہ شیخ معروف اور شیخ علی کس سن میں جاگیر کے انتظام وانصرام کے لیے ولید پور آئے۔ اس لیے بھیرا کی آبادی کی تعیین کی بس ایک صورت بچتی ہے کہ کہا جائے کہ ۸۱۱ھ مطابق ۱۴۰۸ء کے بعد بھیرا آباد ہوا۔ اگر جاگیر ملنے اور شیخ معروف اور شیخ علی کے ولید پور آنے کے درمیان قیاس سے کام لیتے ہوئے بیس سال کا وقفہ مان لیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ ان لوگوں نے ولید پور آنے کے پانچ سال بعد سلطان پور کے نام سے گاؤں آباد کیا، تب بھی اس گاؤں کی قدامت ۱۴۴۴ھ میں سن ہجری کے اعتبار سے چھ سو سال سے زائد ہوتی ہے اور ۲۰۲۲ء میں سن میلادی کے اعتبار سے چھ سو سال سے چند سال کم ہوتی ہے۔

تحریری طور پر اس گاؤں میں اقامت کا جو پختہ ثبوت ملتا ہے، وہ شیخ ابوالخیر سے متعلق ملتا ہے کہ وہ حج سے واپس آئے تو ولید پور میں نزول کیا اور پھر کچھ دنوں کے بعد سلطان پور منتقل ہو گئے۔ صاحبِ مناقب غوثی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

''بشرف زیارت حرمین شریفین سعادت ابدی دریافت، چندے مجاور آں اشرف المکان بودہ معاودت بوطن فرمود بلباس آزادانہ ولید پور تشریف آورد در سلطان پور کہ الآن بہ بھیرہ مشہور است بارِ اقامت نہاد۔''[۲]

زیارتِ حرمین شریفین کی ابدی سعادت کا شرف حاصل کیا، چند دن وہاں مقیم رہے، اس کے بعد وطن لوٹے اور سادے لباس میں ولید پور تشریف لائے، سلطان پور میں جو کہ اب بھیرا سے مشہور ہے، اقامت اختیار کر لی۔

اس سے شبہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ سلطان پور کی بنیاد شیخ ابوالخیر کے ہاتھوں پڑی ہو۔

اس شبہے کو تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ بھیرا میں شیخ ابوالخیر کی قبر سے قدیم قبر نہیں ملتی جو محلہ پچھّم میں دریاے ٹونس کے کنارے واقع ہے۔ اگر اس سے پہلے کی آبادی ہوتی تو اس خانوادے کے بزرگوں کی قبر کا سراغ ملنا چاہیے، جیسا کہ ولید پور میں اس خانوادے کے بزرگوں کی قبریں موجود ہیں اور شیخ ابوالخیر کے قریب ترین جد جن کی قبر کا سراغ ولید پور میں ملتا ہے، وہ ملا محمود کے دادا شیخ بڑے ہیں، جو خاندانی لحاظ سے شیخ ابوالخیر کے بھی جد ہیں۔[۳]

اس شبہے کو تقویت دینے والی دوسری چیز شیخ ابوالخیر کے ولید پور سے سلطان پور جانے کا پس منظر بھی ہے۔ شیخ ابوالخیر کے تذکرے میں آگے آئے گا کہ وہ شاہ جہاں کے مصاحب تھے، اس کے ساتھ ایک مرتبہ سیال کوٹ حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ جہاں نے کچھ نقد ہدیہ دینا چاہا تو انھوں نے شیخ ابوالخیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ 'اس ہدیے کے زیادہ لائق یہ ہیں، طرح طرح کی مشقت اٹھا کر علم حاصل کیا اور اب حصولِ آبرو کے لیے اس کو بے جا صرف کر رہے ہیں۔' یہ بات شیخ ابوالخیر کے دل میں ترازو ہوگئی اور اسی وقت انھوں نے دنیا سے قطعِ تعلق کا ارادہ کر لیا اور بادشاہ کی مصاحبت ترک کر کے حج بیت اللہ کے لیے نکل گئے اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

ممکن ہے کہ حج سے واپسی کے بعد وہ ولید پور آئے ہوں جہاں ان کے خانوادے کے لوگ بود و باش رکھتے تھے، مگر انھیں کامل یک سوئی اور خلوت وہاں نصیب نہ ہوئی ہو جو ایک درویش کی آرزو ہوتی ہے، ہنگامہ ہاے دنیا سے بچنے کے لیے انھوں نے دریاے ٹونس کے کنارے ایک پُر فضا جگہ کو پسند کیا ہو اور وہیں جا کر اپنی کٹیا بسائی ہو، پھر آہستہ آہستہ خانقاہ اور دوسرے مکانات بھی آباد ہوتے چلے گئے ہوں، جب آبادی کی شکل ہوگئی ہو تو اسے سلطان پور کا نام دے دیا گیا ہو جو شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے زمانے تک آتے آتے آستانہ بھیرا سے بدل گیا ہو۔

اگر اس قیاس کو درست مانیں تو پھر یہ یقینی ہے کہ بھیرا کی بنیاد ۱۰۵۶ھ مطابق ۱۶۴۶ء کے بعد پڑی ہے۔ کیوں کہ ۱۰۵۶ھ ہی میں شیخ ابوالخیر کو حج و زیارت کی دولت حاصل ہوئی تھی۔[۴] اس لحاظ سے بھی بھیرا کی قدامت ۱۴۴۴ھ میں سن ہجری کی میزان سے پونے چار سو سال سے زائد ہوتی ہے اور ۲۰۲۲ء میں سن عیسوی کے اعتبار سے ٹھیک پونے چار سو سال ہوتی ہے۔

ان سارے قیاسات کی ضرورت اس لیے پڑ رہی ہے کہ ہمارے پاس کوئی تحریری یا پختہ ثبوت نہیں ہے۔ شیخ ابوالخیر کی قلمی کتاب 'شیر و شکر' اس سلسلے میں بے حد معاون ہو سکتی تھی، مگر تلاشِ بسیار کے باوجود اس سے محرومی رہی۔ اگر شیر و شکر مل جائے تو یقین کے ساتھ بھیرا کی تاسیس کی تعیین ہو سکتی ہے یا اگر حتمی تعیین نہ بھی ہو سکے تو بھی ہم زمانۂ تاسیس کے بالکل قریب پہنچ سکتے ہیں اور غالب گمان کی بنیاد پر تاسیس کا کوئی سن متعین کر سکتے ہیں۔

سرزمینِ بھیرا کی بارہویں صدی ہجری کی سب سے مقبول و متعارف شخصیت شیخ ابوالغوث کی تھی۔ یوں تو ان کا خاندان چندے آفتاب و چندے ماہ تاب کا مصداق تھا، مگر جو شہرت و مقبولیت شیخ ابوالغوث کو ملی، وہ کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ نام ابوالغوث تھا، مگر گرم دیوان کے نام سے مشہور ہوئے۔ گرم دیوان نام پڑنے کی وجہ کیا ہے، اس سلسلے میں تین روایات ملتی ہیں:

۱- مناقب غوثی میں ہے:

''بامرِ الٰہی از جناب ولایت مآب حضرت شاہ فتح محمد مرشد خود بہ خطاب گرم دیوان سرفرازی یافت۔''[۵]

امرِ الٰہی سے اپنے مرشد ولایت مآب حضرت شاہ فتح محمد کی طرف سے گرم دیوان کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

۲- بحر زخار میں ہے:

''در ہند اکثر درویش را دیوان می گویند، از جہت جلال خاطرش گرم دیوان می گفتند۔'' [۶]

ہندستان میں اکثر درویش کو دیوان کہتے، اس لیے ان کے طبعی جلال کی وجہ سے انھیں گرم دیوان کہا جانے لگا۔

۳- صاحب تذکرہ علماے ہند نے لکھا ہے:

''وے را گرم دیوان ازاں گویند کہ جسم مبارکش در بعض اوقات بخرقِ عادت بدرجہ غایت گرم می شد کہ نان گندم براں تواں پخت۔''[۷]

ان کو گرم دیوان اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ان کا جسم مبارک بعض اوقات خلافِ عادت اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ اس پر گیہوں کی روٹی پکائی جا سکتی ہے۔

مناقب غوثی کی روایت کے اعتبار سے گرم دیوان کے پس منظر میں کوئی واقعہ یا خرقِ عادت شے نہیں ہے، بلکہ یہ محض ایک خطاب ہے جو مرشد کی جانب سے عطا ہوا۔ بحر زخار کے مطابق گرم دیوان کا لقب عوام کا دیا ہوا ہے جو ان کے طبعی جلال کی مناسبت سے ان پر چسپاں ہوا۔ تذکرہ علمائے ہند کے اعتبار سے گرم دیوان کے پیچھے ان کی ایک خرقِ عادت کرامت ہے جو گرم دیوان کے لقب کا سبب بنی۔ تینوں روایتوں میں زیادہ قرینِ صواب مناقبِ غوثی کی روایت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شیخ شمس الدین حیدری شیخ ابوالغوث کے مرید وخلیفہ اور ان کے صحبت یافتہ تھے، اس لیے ان کی بات بعد والوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتماد سمجھی جائے گی۔

اور اس وجہ سے بھی کہ شیخ شمس الدین حیدری نے جس مبالغہ آمیز عقیدت مندی کا مظاہرہ مناقبِ غوثی میں کیا ہے، ان سے توقع یہی ہے کہ اگر اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہوتا تو وہ اس پر مزید رنگ و روغن لگا کر بیان کرتے، حالاں کہ انھوں نے اس واقعے کا پوری کتاب میں کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ بھی خارج از امکان ہے کہ کہا جائے کہ شیخ شمس الدین حیدری کو اس واقعے کا علم نہیں رہا ہوگا۔ کیوں کہ خلافِ معمول اور خلافِ عادت یہ ایسا واقعہ ہے کہ اس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ شیخ ابوالغوث کے اتنے قریب رہنے والا شخص اس سے لاعلم رہ جائے اور پھر یہ کہ ان کا سوانح نگار لاعلم رہ جائے۔ شیخ شمس الدین حیدری نے مناقبِ غوثی کا چھٹا باب شیخ ابوالغوث کی کرامت ہی بیان کرنے کے لیے باندھا ہے، مگر اُس میں بھی اِس خرق عادت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

بحر زخار کی روایت قیاسی اور تخمینی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا غالب امکان ہے کہ چوں کہ ہندستان میں مشائخ کو دیوان کہا جاتا تھا، شیخ ابوالغوث کے نام کے ساتھ گرم دیوان کا لقب دیکھ کر صاحبِ جلال ہونے کا گمان کر لیا گیا ہو، اور اسی کے مطابق گرم دیوان نام پڑنے کی وجہ بتا دی گئی ہو۔ یعنی صاحبِ جلال درویش۔ صاحبِ مناقب غوثی نے شیخ ابوالغوث کے صاحبِ جلال ہونے

کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کوئی ایسا واقعہ لکھا ہے جس سے ان کا صاحبِ جلال ہونا ثابت ہوتا ہو، بلکہ اس کے برعکس ان کے تحمل کے بیان میں ایک باب ضرور لکھا ہے۔

تذکرہ علماے ہند والی روایت نے زیادہ شہرت پائی اور زبان زدعوام ہوئی، بلکہ ''نانِ گندم براں تواں پخت''، یعنی جسم پر روٹی پکائے جاسکنے کو عوام نے قوت سے فعل میں ڈھال دیا اور اس کی بھی شہرت ہوگئی کہ جو روٹی ان کی پشت پر پکائی گئی تھی، وہ ابھی قریب زمانے تک کچھ لوگوں کے گھروں میں موجود تھی۔ اور وہ روٹی بھی عام حجم کی روٹی نہیں تھی بلکہ کئی کلو آٹے کی موٹی روٹی تھی، جسے ہمارے عرف میں ٹِکّرِی کہا جاتا ہے۔ ۲۰۲۰ء میں میں شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے لہرا گیا تو وہاں بھی کچھ لوگوں نے بڑے وثوق سے مجھے باور کرانے کی کوشش کی کہ اس روٹی کا ایک ٹکڑا ابھی دس بیس سال پہلے ایک صاحب کے گھر موجود تھا۔ میں نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو بتایا گیا کہ ضائع ہوگیا ہے۔ ان صاحب کا نام پوچھا جن کے یہاں تھی تو صداے برنہ خاست۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کا مزار لہرا ضلع اعظم گڑھ میں واقع ہے۔ لہرا اعظم گڑھ و محمد آباد شاہ راہ پر جانبِ شمال ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں کا ابتدائی نام وحدت آباد لہرا ہے، مگر مرورِ ایام سے وحدت آباد کا سابقہ ختم ہوگیا اور صرف لہرا بچا۔ گاؤں کے ایک کنارے شیخ ابوالغوث کا کھلا ہوا مزار آج بھی موجود ہے۔ مزار سے متصل دکھن کی طرف مسجد ہے اور مسجد ہی سے لگ کر شیخ کی خانقاہ اور مکان کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ مزار کی دیکھ ریکھ کے لیے شیخ کے اہل خاندان نے لہرا گاؤں کے ایک صاحب کو متعین کر رکھا ہے جس کی وجہ سے کبھی رنگ و روغن ہوجاتا ہے اور ویرانی کا احساس کم ہوجاتا ہے۔

شیخ ابوالغوث کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے حافظ عبدالعلیم صاحب اپنے والد کے کچھ تبرکات لے کر غازی پور چلے گئے اور موضع دھاوا جہاں شیخ ابوالغوث غازی پور میں قیام کے دوران رہے تھے، وہاں لے جاکر دفن کر دیا اور شیخ کی وہاں کی خانقاہ کو پھر سے آباد کیا اور وہاں کے سجادہ نشین بنے۔ حافظ عبدالعلیم بعد میں غازی پور سے واپس بھیرا آ گئے تھے اور بھیرا ہی

میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور بھیرا ہی میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے شاہ باسط علی پھر سے غازی پور چلے گئے اور دھاوا کی خانقاہ کے سجادہ نشین بنے۔ دھاوا میں اگر چہ شیخ ابوالغوث کا اصل مزار نہیں ہے، مگر چوں کہ ان کے اہل خاندان کا اقامتی تعلق وہیں سے ہو گیا تھا، اس لیے وہاں ان کے عرس کا سلسلہ چل پڑا جو آج تک جاری ہے۔ یہ عرس ۲۴، ۲۵ اور ۲۶ جمادی الثانیہ کو ہر سال منعقد ہوتا ہے۔[۸]

شاہ باسط کی اولاد میں شاہ محمد حسن اعلی مقام بزرگ گزرے ہیں، ان کی ولادت موضع دھاوا ہی میں ہوئی تھی۔[۹]

حافظ عبدالعلیم کے ایک پوتے مولانا شاہ فخر الدین بڑے صاحبِ کمال بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی پیدایش موضع دھاوا غازی پور میں ۱۹۰۳ء میں ہوئی۔ تعلیم گھر ہی پر حاصل کی، طویل مدت مجاہدات و ریاضات میں بسر کی، حج بیت اللہ سے بھی سرفراز ہوئے۔ ۱۴ مارچ ۱۹۷۹ء [۱۰] کو انتقال ہوا اور خانقاہ دھاوا میں مدفون ہوئے۔ ۱۴- ربیع الثانی کو ان کے عرس کا بھی ہر سال اہتمام ہوتا ہے۔[۱۱]

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے تبرکات کی تدفین کے بعد دھاوا خانقاہ کے جو سجادہ نشین ہوئے ہیں، ان کے نام بالترتیب یہ ہیں:

۱- حافظ عبدالعلیم بن شیخ ابوالغوث گرم دیوان
۲- شاہ باسط علی بن حافظ عبدالعلیم
۳- شاہ محمد حسن بن شاہ باسط علی
۴- شاہ احمد کریم
۵- شاہ محمد فخر الدین
۶- شاہ محمد شرف الدین
۷- مولانا مفتی شمس الضحیٰ [م: ۱۷ فروری ۲۰۲۲ء] وصوفی عبیدالرحمان
۸- ابوالحسن ابن مفتی شمس الضحیٰ- مجیب الرحمان ابن صوفی عبیدالرحمان [موجودہ سجادہ نشین]

۲۰۲۰ء میں شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے آثار کی تلاش میں مجھے دھاوا جانے کا اتفاق

ہوا، وہاں پہنچ کر ایک عجیب چیز دیکھی کہ قبروں پر جو تختیاں لگی ہوئی تھیں، ان میں سب کے نام سے پہلے سید لکھا ہوا تھا۔ اس خانوادے کا فاروقی ہونا جگ ظاہر ہے۔ خود شیخ ابوالغوث گرم دیوان نے اپنے ایک مکتوب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہوئے انھیں اپنا جد امجد لکھا ہے:

''در صحیحین می آرد نقلاً بعد نقلٍ از جدی شیخ الشیوخ الفارق بین الخطا والصواب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔''[۱۲]

صحیحین میں نقل متواتر سے میرے جد امجد شیخ الشیوخ ،الفارق بین الخطا والصواب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

صاحبِ مناقب غوثی نے جو سلسلہ نسب درج کیا ہے، اسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچایا ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے دیار پورب میں علم اور علما میں شیر وشکر کی ایک عبارت نقل کی ہے جس میں صراحت کے ساتھ نسب آل فاروقی اور خانوادۂ فاروقیاں لکھا ہوا ہے:

''باب سوم در ذکر نسب آل فاروقی و برخے از سوانح احوالِ خانوادۂ فاروقیاں وسبب توطن قبیلۂ کاتب الحروف بولایت جون پور وغیرہ کہ تعلق بداں احوال دادر۔''[۱۳]

اتنی ساری صراحتوں کے بعد بھی سید لکھنا قابل تعجب ہے۔ اس استعجاب کا ازالہ اس طرح سے ہوا کہ تذکرہ مشائخ غازی پور کے مصنف عبیدالرحمان صدیقی صاحب سے ایک مرتبہ ملاقات کے لیے ان کے درِدولت پر حاضر ہوا، ان سے اپنے اس کام کا ذکر کیا اور تذکرہ مشائخ غازی پور کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے کتاب عنایت کی اور بتایا کہ میں نے اس میں گرم دیوان صاحب کے خانوادے کو سید لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ احوال جمع کرنے کے لیے میں جب اس خانوادے کے لوگوں سے ملا تو انھوں نے اپنے کو سید ظاہر کیا اور اس پر اصرار بھی کیا۔ اور اپنا نسب نامہ دکھلایا اور اعتماد دلایا کہ یہی درست نسب نامہ ہے۔ میں نے ان پر اعتماد کر کے اس خانوادے کے سارے لوگوں کو سید لکھ دیا۔ کتاب طبع ہونے کے بعد جب لوگوں کی شکایتیں آنے لگیں تب مجھے صحیح اور غلط کا اندازہ ہوا۔

تذکرہ مشائخ غازی پور میں جو نسب نامہ دیا ہے، وہ سلطان تاج الدین محمد تک تو وہی

ہے جو مناقبِ غوثی میں مذکور ہے، مگر اس کے بعد سید بہاء الدین، سید جلال الدین، سید علی جمال داؤد، سید ابونصر صالح، سید عبدالرزاق سے ہوتا ہوا سید عبدالقادر جیلانی سے جاملا ہے [۱۴]۔ جب کہ مناقبِ غوثی میں سلطان تاج الدین محمد کے بعد ترتیب یہ ہے: سلطان عزالدین محمد بن سلطان سلیمان شاہ بن نعمان شاہ بن سلطان احمد فرخ شاہ بن مسعود بن امام الائمہ واعظ الاصغر بن امام الائمہ واعظ الاکبر بن ابوالفتح بن امام اسحاق بن امام سالم بن حضرت عبداللہ بن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما۔ [۱۵]

البتہ تذکرہ مشائخ غازی پور کے نسب نامے میں ایک غلطی اور ہے جسے سہو کتابت کہا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ شاہ معروف اول کے بعد شاہ مشیر لکھا ہے۔ شاہ معروف اول کے والد کا نام شیخ مشید تھا۔ غالب گمان ہے کہ کتابت میں مشید مشیر ہو گیا ہو۔

مناقبِ غوثی شیخ شمس الدین حیدری کی تصنیف ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ شیخ حیدری شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے مرید باصفا اور خلیفہ تھے۔ ان کا ذکر خلفا کے باب میں آئے گا ان شاء اللہ۔ کتاب کی تہذیب اور عبارتوں کی آرایش وزیبایش شیخ حیدری کے داماد شیخ نور محمد کامیاب نے کی ہے۔ شیخ نور محمد بھی شیخ ابوالغوث کے مرید و خلیفہ تھے۔ خلفا کے باب میں ان کا بھی ذکر آئے گا ان شاء اللہ۔ مناقبِ غوثی کی طباعت کی نوبت نہیں آئی، معرضِ وجود میں آنے کے بعد سے دست بہ دست نقل و کتابت کے عمل سے گزرتی ہوئی منتقل ہوتی رہی۔ اس کے دو قلمی نسخے دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں محفوظ ہیں۔ ہم نے اس کتاب کی تیاری میں انھیں دونوں قلمی نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔

دونوں قلمی نسخے صاف ستھرے اور عمدہ حالت میں ہیں۔ پہلے نسخے کی کتابت موٹے قلم سے ذرا گنجلک ہے اور سوادِ تحریر خطِ شکستہ سے قریب ہے، مگر بہ آسانی پڑھا جاتا ہے۔ یہ نسخہ صفحہ نمبر کے اندراج سے عاری ہے، ۱۱۷۸ھ [۶۵ / ۱۷۶۴ء] میں یعنی جس سال شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی وفات ہوئی، اسی سال نقل و کتابت کے عمل سے گزرا ہے۔ اس نسخے میں کل ۲۶۰ صفحات ہیں، سطروں کی تعداد ۱۷، ۱۸، ۱۹ ہیں۔ ناقل کے بارے میں کوئی اطلاع درج نہیں ہے۔ متن کے حوض کا عرض کم ہے اور حروف ذرا جلی ہیں اور بیشتر صفحات میں کنارے تین طرف حواشی

بھی درج ہیں، اس لیے اس کی ضخامت دوسرے نسخے کی بہ نسبت زیادہ ہوگئی ہے۔ اس نسخے پر جو حواشی ہیں، ان کا متن سے کوئی تعلق ہے اور نہ متن سے متعلق اس میں کوئی وضاحت ہے، بلکہ حواشی میں زیادہ تر عبادت واحسان سے متعلق احادیث یا عربی و فارسی کی عبارتیں ہیں۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ کس مناسبت سے بہ طور حاشیہ یہ عبارتیں درج کی گئی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ کتاب ایک صوفی بزرگ کے ذکر خیر میں ہے تو بہ طور حاشیہ ایسی عبارتیں درج کردی گئیں ہیں جو ان کے مسلک ومشرب کی غماز وترجمان ہوں، تاکہ پڑھنے والے کو یک گونہ انسیت رہے۔

دوسرے نسخے کی کتابت باریک قلم سے بہت صاف، روشن اور خط نستعلیق میں ہے۔ یہ نسخہ ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے، اول وآخر صفحے ملالیں جن پر کتاب اور نقلِ کتاب کی تفصیل ہے تو ۲۰۷ صفحات ہوجائیں گے۔ ابتدا کے چند صفحات میں ۹ / ۱۰ سطریں ہیں اور بیشتر صفحات میں ۱۲ / ۱۳ سطریں ہیں۔ یہ نسخہ ۱۹۰۶ء میں نقل ہوا ہے، ناقل کا نام محمد نعیم الحق آزاد ہے۔ مولانا محمد عبدالغفور صاحب ریٹائرڈ سب جج کے حکم سے یہ نسخہ نقل کیا گیا ہے۔ فی الحال دارالمصنّفین اعظم گڑھ کا مملوکہ ہے اور اس کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے سرورق پر جو تفصیل دی ہوئی ہے، وہ حسب ذیل ہے:

مناقب غوثی

یعنی

تذکرہ شاہ ابوالغوث گرم دیوان قدس سرہ

حسب الارشاد

عالیجناب مولانا المولوی محمد عبدالغفور صاحب ریٹائرڈ سب جج[۱۶]

ورئیس محمد آباد گہنہ ضلع اعظم گڈہ در ۱۹۰۶ء نقل نمودہ شد

بقلم محمد نعیم الحق آزاد متوطن شیخپور ضلع بلیا[۱۷]

اور آخری صفحے پر نقلِ کتاب سے متعلق یہ عبارت ہے:

کتاب ہذا حسب الارشاد جناب مولانا المولوی محمد عبدالغفور صاحب فاروقی ریٹائرڈ سب جج رئیس محمد آباد گہنہ ضلع اعظم گڈہ ابن حضرت منشی محمد اکرام صاحب مرحوم در

۱۹۰۶ء نقل نمودہ شد بقلم محمد نعیم الحق آزاد ابن مولوی شیخ فضل کریم صاحب صدیقی ساکن موضع شیخ پور پرگنہ سکندر پور ضلع بلیا

نعیم الحق آزاد

۱۷ دسمبر ۱۹۰۶ء

مناقب غوثی کی تصنیف کی ابتدا ذی الحجہ ۱۱۴۴ھ/ ۳۲-۱۷۳۱ء [۱۸] میں ہوئی، تکمیل کے بعد اس میں شیخ حیدری نے اضافے بھی کیے۔ مثلاً شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے غازی پور جانے کا واقعہ اور ان کی وفات کے احوال کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔ شیخ نور محمد کامیاب نے بھی دورانِ تہذیب جگہ جگہ فائدہ کا عنوان لگا کر فوائد تحریر کیے ہیں۔ ان کے بیشتر فوائد تصوف وصوفیہ سے متعلق ہیں اور بعض فوائد علم کلام اور ردِ فرقۂ باطلہ سے متعلق بھی ہیں۔

کتاب کے شروع میں شیخ نور محمد کامیاب کا ابتدائیہ ہے، جس میں حمد وثنا کے بعد کتاب کی تہذیب وآرایش اور شیخ ابوالغوث گرم دیوان سے اپنے تعلق کا اجمالاً ذکر ہے۔ اس کے بعد شیخ شمس الدین حیدری کا مقدمہ ہے جس میں حمد وثنا کے بعد کتاب کی وجہِ تصنیف اور سنِ تصنیف کا ذکر اور کتاب کے ابواب سے متعلق معلومات ہیں۔ اس کے بعد حضرت شیخ غلام احمد چراغ ہندی اور ان کے سلسلے کے مشائخ کا مختصراً ذکر ہے۔ شیخ شمس الدین حیدری حضرت شیخ غلام احمد چراغ ہندی سے بھی بیعت تھے اور ان سے ارادت وعقیدت کا تعلق رکھتے تھے۔ ذکر مرشد کی مناسبت سے اپنے اِس سلسلے کے مشائخ کا بھی اجمالاً ذکر کر دیا جو نادر معلومات پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں جن مشائخ کا ذکر آیا ہے، ان کے نام بالترتیب یہ ہیں:

۱- حضرت شیخ الاسلام شیخ شہر اللہ
۲- حضرت شیخ بہاء الدین قتال
۳- حضرت شیخ علاء الدین قتال بن حضرت شیخ بہاء الدین قتال
۴- حضرت شیخ راجو قتال بن شیخ علاء الدین
۵- حضرت شیخ عبداللہ بن حضرت شیخ راجو قتال
۶- حضرت شیخ فتح اللہ بن حضرت شیخ عبداللہ

۷- حضرت شیخ نظام بن شیخ فتح اللہ
۸- حضرت شیخ ابوالفتح بن حضرت شیخ نظام
۹- حضرت شیخ غلام احمد چراغ ہندی بن حضرت شاہ ابوالفتح

ان مشائخ میں تفصیلی ذکر صرف آخرالذکر دو بزرگوں کا ہے۔یعنی حضرت شیخ ابوالفتح اور حضرت شیخ غلام احمد چراغ ہندی کا، بقیہ مشائخ میں بعض کا انتہائی سرسری عام معلومات پر مشتمل ہے اور بعض میں کچھ نادر معلومات آگئی ہیں۔

مقدمے کے بعد کتاب کی ابتدا ہوتی ہے۔کتاب میں کل آٹھ ابواب ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے:

باب اول: در بیان ولادت باسعادت حضرت مرشد حقیقی از صغرسن گرفتہ تا ابتدائے بلوغ وآں چہ بداں مناسبت دارد۔

باب دوم: در بیان ایام بلوغ وظہور منشاء شوق الٰہی و برآمدن آں حضرت از خانہ در طلب مرشد کامل و بہرہ یافتن از انفاس متبرکہ مرشد وآں چہ تعلق دارد۔

باب سوم: درعقد مناکحت آں حضرت وآں چہ تعلق دارد۔

باب چہارم: داخل شدن کاتب حروف درسلک منتسبان آستان فیض نشان و بذل تلطفات آں محبوب الرحمان برحال ایں طالب صادق۔

باب پنجم: در بیان رضا وتحمل وقناعت وتوکل آں حضرت۔

باب ششم: در بیان کرامات وخوارق عادات آں حضرت۔

باب ہفتم: مشتمل برمکاتبات کہ آں حضرت بہ خلفاء خودنوشتہ بودند۔

باب ہشتم: در بیان احوال اجداد بزرگوار آں حضرت و مشتمل برذکر بعضے بزرگان ایں دیار۔

باب ہشتم کے بعد کتاب کا تتمہ ہے جسے شیخ ابوالغوث کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا۔ تتمے

میں غازی پور جانے کے اسباب، قیام غازی پور کے واقعات اور غازی پور سے واپسی کی وجوہات ذکر کی گئی ہیں۔ اخیر میں تین صفحے میں شیخ ابوالغوث کے آخری ایام کی تفصیل ہے۔

یہ کتاب قدیم طرز و اسلوب کی سوانح ہے۔ شیخ ابوالغوث کی ذات کے آس پاس یا ان سے متعلق ہر واقعے یا حادثے کو بھاری بھر کم الفاظ میں ان کی کرامت سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔ گویا پیراں نمی پرند مریداں می پرانند کی مصداق ہے۔ پوری کتاب میں زیادہ توجہ کرامات و خرقِ عادات پر دی گئی، جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے کئی اہم پہلو پوشیدہ رہ گئے ہیں۔ مثلاً شیخ ابوالغوث نے کہاں تعلیم حاصل کی، کس سے حاصل کی اور کب حاصل کی، اس کا صریح ذکر کتاب میں نہیں ہے۔ ان کے علمی کمالات تو خرقِ عادت کے بیان کے بوجھ تلے دب کر نابود ہو گئے ہیں۔ ان کی علمی حیثیت اور کمالات کا کچھ سراغ ان کے مکاتیب میں ملتا ہے، مگر مکاتیب بھی جو نقل ہوئے ہیں، وہ بیشتر شیخ شمس الدین حیدری کے نام ہیں اور چند ایک دوسرے خلفا کے نام ہیں، اس لیے ان میں زیادہ تر تصوف اور اس سے متعلق مسائل و مباحث ملتے ہیں، جن سے تصوف اور اس کے متعلقات پر شیخ ابوالغوث کی گہری بصیرت و مضبوط گرفت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، بقیہ علوم وفنون مثلاً تفسیر و حدیث اور کلام و بیان اور زبان و ادب کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔

کتاب کا نصف حصہ کلامِ منظوم سے مملو ہے۔ جگہ جگہ شیخ ابوالغوث کے قصیدے درج ہیں۔ بیشتر نظمیں شیخ حیدری ہی کی ہیں اور اقل قلیل دوسرے شعرا کی ہیں۔ نظمیں بھی ایسی نہیں ہیں کہ ان سے شیخ ابوالغوث کی حیات وخدمات اور کمالات کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہو، بلکہ عموماً نثر میں ایک بات کہی گئی ہے اور پھر اسی کو نظم میں دہرا دیا گیا ہے یا پھر نثر میں شیخ کی کوئی صفت اور خوبی بیان کی گئی اور پھر نظم میں اس خوبی کے نتائج وفوائد کو پھیلا کر بیان کر دیا گیا۔ کہیں پر شیخ ابوالغوث کے فراق اور اپنی تڑپ کو نثر میں دو سطر میں بیان کیا ہے اور پھر اس فراق کی تصویر کشی دس بارہ شعر میں کی ہے، وصال کی خبر ایک سطر میں ہے اور وصال کے لذائذ کا بیان بارہ پندرہ اشعار میں ہے۔ اگر اشعار کو کتاب سے منہا کر دیا جائے تو کتاب کی ضخامت نصف ہو جائے گی۔

اشعار کے ساتھ بھاری بھر کم الفاظ اور مقفا و مسجع جملوں اور عبارتوں کا بھی خاصا اہتمام

کیا گیا، القاب وآداب میں وہ مبالغہ آرائی ہے کہ بس نہ پوچھیے۔ بعض مقام پر القاب کا ایسا بے دریغ استعمال ہوا ہے کہ نصف صفحہ اسی کی نذر ہوکر رہ گیا۔ اگر غیر ضروری الفاظ اور القاب نکال دیے جائیں تو کتاب کی ضخامت نصف سے بھی کم ہوکر رہ جائے گی۔

الغرض یہ کتاب قدیم طرز واسلوب کی نمایندہ سوانح ہے اور غلوآمیز عقیدت کی شاہ کار ہے، جس میں پیر کے مرتبے کو بڑھانے پر پوری توجہ دی گئی ہے اور کوشش کی گئی کہ اردگرد ہونے والے ہر واقعے اور حادثے کو پیر کی کرامت کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ سوانح کا جو مقصد ہوتا ہے یعنی صاحبِ تذکرہ کے احوال واخلاق، عادات واطوار اور اس کے علمی وعملی کمالات جو بعد کے لوگوں کے لیے عبرت وموعظت کا سبب بن سکیں اور دلیلِ راہ کا کام دے سکیں، وہ بہت حد تک مفقود ہے۔

بہرکیف! کتاب جیسی بھی ہے، اسے شیخ ابوالغوث کے تذکرے میں اولیت حاصل ہے اور اس کا امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ صاحبِ تذکرہ کی حیات میں لکھی گئی ہے اور ان کے ایک مرید حاضر باش نے لکھی ہے، اس لیے اس کی استنادی حیثیت سارے تذکروں میں سب سے فائق ہے۔ شیخ ابوالغوث کے بارے میں جو معلومات اس میں فراہم کی گئی ہیں، کسی تذکرہ نگار نے اس پر اضافہ نہیں کیا ہے، بلکہ ماضی قریب کے سارے تذکرہ نگاروں کا راست یا بالواسطہ ماخذ ومصدر یہی کتاب رہی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی بنیاد بھی مناقبِ غوثی ہی ہے۔ یعنی صاحبِ تذکرہ سے متعلق بیشتر معلومات اسی کتاب سے مستفاد ہیں۔ اس کے علاوہ جو مباحث ومعلومات ہیں، ان کا مصدر وماخذ مناقبِ غوثی کے ساتھ دوسری کتابیں بھی ہیں، جن کا مکمل حوالہ درج کر دیا گیا ہے۔ اخیر میں شیخ ابوالغوث کے تذکرہ نگاروں کے تذکروں کا جو تجزیہ کیا گیا ہے، وہ مناقبِ غوثی کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس تجزیے کا مقصد کسی کی تغلیط یا کسی کی محنت کی کمی دکھلانا نہیں ہے، بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ مناقبِ غوثی اور دیگر تذکروں میں جو فرق آ گیا ہے، وہ واضح ہوجائے، تاکہ بعد میں اس ڈگر کے مسافر کے لیے راستہ ہموار رہے۔

حوالے وحواشی

۱- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۳۱۷
۲- شیخ شمس الدی حیدری، مناقب غوثی، قلمی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۱۷۰
۳- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۳۱۸
۴- ایضاً، ص ۳۰۶
۵- شیخ شمس الدی حیدری، مناقب غوثی قلمی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۱۸
۶- شیخ وجیہ الدین اشرف، بحر زخار، مرکز تحقیقات فارسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، جلد اول، ص ۵۶۸
۷- رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، منشی نول کشور لکھنؤ، طبع اول، ۱۸۹۴ء، ص ۵
۸- عبیدالرحمان صدیقی، تذکرہ مشائخ غازی پور، انیس پبلی کیشنز، صمد منزل مچھرہٹہ غازی پور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۱، ۴
۹- ایضاً، ص ۴۳۱
۱۰- تذکرہ مشائخ غازی پور میں لکھا ہے کہ آپ کا انتقال ۱۴ مارچ ۱۹۷۹ء بروز بدھ ۹۰ سال کی عمر میں ہوا۔ غالباً سہو کتابت سے ۹۰ سال ہو گیا ورنہ سال پیدائش ۱۹۰۳ء کے حساب ۷۶ سال ہوتے ہیں۔
۱۱- ایضاً، ص ۴۳۱
۱۲- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، ص ۱۵۱
۱۳- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۳۰۶
۱۴- عبیدالرحمان صدیقی، تذکرہ مشائخ غازی پور، انیس پبلی کیشنز، صمد منزل مچھرہٹہ غازی پور،

۲۰۰۱ء،ص ۴۳۳، ۴۳۴

۱۵- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، ۱۶۰، ۱۶۱

۱۶- المولوی محمد عبدالغفور صاحب فاروقی ریٹائرڈ سب جج رئیس محمد آباد گہنہ بڑے عالم و فاضل اور صاحبِ ثروت انسان تھے۔ صاحبِ قلم تھے، عمدہ اور رواں دواں نثر لکھتے تھے، ان کے مضامین و مقالات سرسید کے زمانے میں تہذیب الاخلاق علی گڑھ میں شائع ہوتے تھے۔ تہذیب الاخلاق، محرم ۱۲۸۸ھ [۱۸۷۱ء] میں 'تقلید مروجہ کی مضرت' کے عنوان سے شائع شدہ ان کا مقالہ میری نگاہ سے گزرا ہے۔ سرسید اور مدرسۃ العلوم سے انھیں بڑا لگاؤ تھا، اس کی تعمیر و ترقی کے لیے گراں قدر عطیے دیا کرتے تھے۔

مولوی محمد عبدالغفور کے والد محمد اکرام سرسید کے قریبی معاونین میں سے تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے زمانے سے سرسید سے ان کا تعلق استوار ہوا اور ۲-اکتوبر ۱۸۶۷ء کو وہ سوسائٹی کے ممبر بنے۔ سرسید نے مسلمانوں کے لیے جب کالج کی تحریک شروع کی تو یہ اس تحریک سے بھی وابستہ ہوئے اور کالج کی عمارت کے لیے ۵۰۰ روپے کا گراں قدر عطیہ دیا۔ سرسید نے ان کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کا ۱۸۷۲ء میں ممبر متعین کیا اور کالج میں سنی طلبہ کی تعلیم کے لیے جو کمیٹی تھی، اس کا ممبر نام زد کیا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں دارالاقامہ کی تعمیر کے لیے محمد اکرام صاحب نے ۱۵۰۰ روپے دیے تھے۔ ان کے صرفے سے جو دارالاقامہ تعمیر ہوا، اس کو انھوں نے اپنے والد شیخ لطف محمد کی طرف منسوب کیا۔ [ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ- جنوری ۲۰۱۴ء، ص ۲۷، ۲۸]

۱۷- محمد نعیم الحق آزاد شیخ پور پرگنہ سکندر پور ضلع بلیا کے رہنے والے تھے۔ شاعر تھے، ابتدا میں صفیر تخلص کرتے تھے مگر بعد میں آزاد ہو گئے۔ امیر مینائی کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھے۔ صفیر سے آزاد ہونے کی تحسین امیر مینائی نے ایک خط میں کی ہے۔ 'چشمہ خضر' کے نام سے شعرا کا ایک تذکرہ لکھا تھا اور اپنے استاذ امیر مینائی کی خدمت میں اصلاح اور تاریخ کہنے کی غرض سے پیش کیا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں ایک مثنوی لکھی جو ۱۸۹۹ء میں 'سیر خلوت' کے نام سے شائع ہوئی۔

مکاتیب امیر مینائی میں نعیم الحق آزاد کے نام امیر مینائی کے آٹھ خط ہیں۔ پہلے خط پر ۱۴ نومبر ۱۸۹۱ء کی تاریخ ہے اور آخری خط پر ۱۳ جنوری ۱۸۹۹ء کی تاریخ ہے۔ [مکاتیب امیر مینائی، مرتبہ

مولوی احسن اللہ خان صاحب ثاقب، مطبع ادبیہ لاٹوش روڈ لکھنو، طبع دوم ۱۹۲۴، ص ۲۹۴ تا ۲۹۹]

بہ طور نمونہ ان کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

دل مضطرب کو تو کاکُل میں باندھا　　آپ آنچل میں کیا جانے کیا باندھتے ہیں
قیامت بپا ہوگی اٹھے گا فتنہ　　وہ جوڑا ایک بلا باندھتے ہیں

ہم نقش پا بھی بن کے نہیں پاتے بیٹھنے　　باد صبا اٹھاتی ہے کوے حبیب سے
پیری میں دل سے پوچھ نہ حالت شباب کی　　ذکر چمن خزاں میں نہ کر عندلیب سے

۱۸- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، ص ٦

◆◆◆

آباواجداد

محبوب الرحمان شیخ شاہ ابوالغوث گرم دیوان کا صلبی تعلق خاندانِ فاروقی سے اور مشربی وابستگی سلسلۂ عالیہ چشتیہ سہروردیہ سے تھا۔ وہ اپنے وقت کے جید عالم، بے مثال مربی اور راہِ سلوک کے بے بدل رہنما تھے۔ تصوف اور طریقِ صوفیہ ان کے خاندان میں نسلوں سے چلا آرہا تھا، جس سے یہ بھی مستفیض ہوئے اور ایک بلند مقام پر فائز ہوئے۔ بے شمار لوگوں کو ان کی ذات سے فیض پہنچا اور نامِ خدا کی لذت سے آشنائی ملی۔ صاحبِ مناقب غوثی کے مطابق ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

ابوالغوث بن محمد شاہ بن مخدوم شاہ اسماعیل بن حاجی ابوالخیر بن ابوسعید بن شیخ معروف ثانی بن شیخ عثمان بن شیخ محمد ماہ بن شیخ چاند بن شیخ معروف اول بن شیخ مشید بن شیخ محمد بن شیخ خضر بن سلطان غیاث الدین محمد بن سلطان تاج الدین محمد بن سلطان عزالدین محمد بن سلطان سلیمان شاہ بن نعمان شاہ بن سلطان احمد فرخ شاہ بن مسعود بن امام الائمہ واعظ الاصغر بن امام الائمہ واعظ الاکبر بن ابوالفتح بن امام اسحاق بن امام سالم بن حضرت عبداللہ بن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما۔[۱]

شیخ خضر

شیخ خضر حضرت شیخ الشیوخ ابوالفتح رکن الدین بن شیخ الاسلام زکریا ملتانی کے خاص اصحاب میں سے تھے اور انھیں سلسلۂ سہروردیہ میں خرقۂ خلافت بھی انھیں سے حاصل تھا۔ سلسلۂ سہروردیہ کے بڑے مشائخ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ملتان سے ترکِ سکونت کر کے دہلی آ گئے

تھے۔ دہلی ہی میں ان کے لائق فائق بیٹے شیخ محمد کی پیدایش ہوئی جنھوں نے بعد میں چل کر سلاسلِ تصوف میں بڑا نام پیدا کیا۔ شیخ خضر کا انتقال دہلی میں ہوا اور وہیں ان کی قبر ہے۔ ان کی وفات کے بعد شیخ محمد نے دہلی سے جون پور ہجرت کی۔[۲]

شیخ محمد

تیموری حملے کے زمانے میں دہلی بڑی پر آشوب جگہ بن گئی تھی، آئے دن کہیں نہ کہیں شورش برپا ہوتی رہتی تھی، جس کی وجہ سے خاص طور سے علما و مشائخ کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ لوگ سکون واطمینان کی تلاش میں دہلی کو خیر آباد کہہ کر مختلف مقامات کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ جون پور اور اس کے اطراف میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی حکم راں تھا اور جون پور دار العلم والفضل بن رہا تھا۔ دہلی سے بہت سے علما و مشائخ ہجرت کر کے جون پور میں اقامت اختیار کر رہے تھے۔ شیخ محمد بھی دل برداشتہ ہو کر اپنے اہل وعیال کے ساتھ جون پور وارد ہوئے اور ایک ویرانے میں اقامت گزیں ہوئے۔ اب وہ ویرانہ محلے میں بدل چکا ہے جس کا نام سپاہ ہے۔ اقامت کی کیفیت یہ تھی کہ بارش ودھوپ سے حفاظت کے لیے کوئی سائبان تک میسر نہیں تھا، ایک درخت کے سایے میں گزران کر رہے تھے۔ برسات کا موسم آیا تو برائے نام بھی بارش نہیں ہوئی، قحط کی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ سلطان ابراہیم اس صورت سے سخت پریشان ہوا، اس نے شیخ المشائخ قاضی نصیر الدین گنبدی[۳] سے اپنی پریشان خاطری کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ گذشتہ کئی مہینوں سے بے سائبان وچھت درخت کے سایے میں گزر اوقات کر رہا ہے۔ شاید بارش اسی کی وجہ سے نہیں ہو رہی کہ بارش سے اسے تکلیف ہوگی۔ سلطان نے تلاش شروع کی اور بالآخر شیخ محمد کے پاس پہنچ گیا۔ ان کی کس مپرسی کی حالت کو دیکھا تو مکان کا انتظام کرنے کی درخواست کی، مگر قبول نہیں ہوئی۔ اصرار کے بعد شیخ محمد گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی بنانے پر رضامند ہوئے جسے سلطان نے فوراً تیار کرا دیا اور شیخ کے اہل وعیال اس میں منتقل ہوئے۔

صاحبِ مناقب غوثی کی صراحت کے مطابق شیخ محمد کے منتقل ہوتے ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ سلطان ابراہیم شیخ محمد سے بہت متاثر ہوا اور اس کے دل میں ان کی بے حد قدر

ومنزلت بڑھ گئی اور ہر طرح سے ان کا خیال رکھنا شروع کر دیا۔

جون پور میں شیخ محمد کے علم و فضل اور ورع و تقوی کا غلغلہ بلند ہوا تو بڑے بڑے اہل علم ان کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہونے لگے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی اکثر خدمت میں حاضر ہوتے۔ قاضی صاحب نے حواشی کافیہ کا ایک نسخہ شیخ محمد کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا کہ ایک نگاہ پڑ جائے تو یہ مقبول و مفید ہو جائے۔ شیخ محمد نے ملاحظہ کے بعد فرمایا کہ 'کافیہ را زینت دادہ است'، یعنی کافیہ کو زینت بخش دی۔ [۴]

جون پور میں اس وقت ایک صاحب سجادہ شیخ سدو تھے، انھوں نے جب شیخ محمد کی مقبولیت و محبوبیت دیکھی تو انھیں کد ہو گئی اور شیخ محمد کے در پئے آزار ہو گئے۔ بالآخر انھیں کی جاں گسل حرکت کی وجہ سے شیخ محمد کی ۳ جمادی الاولیٰ ۸۱۱ھ [۲۴ ستمبر ۱۴۰۸ء] کو موت واقع ہوئی۔ [۵] شیخ محمد کی قبر محلہ سپاہ میں روضہ حضرت خواجہ سون بریس سے دکھن ہے۔ [۶]

شیخ محمد کی وفات سے سلطان ابراہیم شرقی کو سخت صدمہ پہنچا اور اس نے شیخ محمد کے بیٹے شیخ مشید کو ان کا جانشین اور صدرِ مسند بنایا اور گزر اوقات کے لیے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد میں ولید پور اور اس کے اطراف میں بارہ مواضع بہ طور جاگیر عطا کیے۔ ان مواضع میں دو کی تعیین تو ملتی ہے۔ یعنی ولید پور اور وحدت آباد لہرا، بقیہ مواضع کی صراحت نہیں ملتی۔ اس وقت سلطان پور بھیرا آباد نہیں ہوا تھا، مگر بھیرا جن اراضی پر آباد ہے، وہ اراضی بھی جاگیر میں شامل تھیں۔

شیخ محمد کے دو لڑکے تھے۔ شیخ مشید اور شیخ وجیہ الدین۔ شیخ وجیہ الدین کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، غالباً صرف بیٹیاں ہی تھیں۔ اس لیے ان کی نسل نہیں چلی۔

شیخ مشید

شیخ مشید عظیم الشان اور قوی الحال بزرگ تھے اور والد کی طرح ان کا شمار بھی بڑے اہل اللہ میں ہوتا تھا۔ شیخ مشید کے دو فرزند تھے: شیخ معروف اور شیخ علی۔ شیخ معروف کو شیخ مشید نے خرقۂ خلافت اور سلسلۂ سہروردیہ کی امانت عطا کی اور دنیا سے رخصت ہوئے۔ صاحب مناقب غوثی نے سال کی تعیین کے بغیر ان کی تاریخ وفات ۲۲ جمادی الثانیہ لکھی ہے۔ شیخ مشید کا مزار جون پور

میں واقع ہے۔

بہ طور جاگیر جو مواضع ابراہیم شاہ شرقی کی طرف سے عطا ہوئے تھے، شیخ علی ان کا انتظام وانصرام دیکھتے تھے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے فرزند شیخ بایزید جاگیر وزمین داری کے منتظم ومنصرم بنے اور طویل مدت تک سارا انتظام انھیں کے ہاتھ میں رہا۔ شیخ بایزید کے انتقال کے بعد جاگیر شیخ معروف اور شیخ علی کی اولاد کے درمیان تقسیم ہوگئی۔[۷]

شیخ معروف [اول]

شیخ معروف عظیم القدر، صاحبِ ولایت اور بابرکت انسان تھے، سیر وسلوک میں بڑی شان رکھتے تھے۔ یہ اپنے والد شیخ مشید کے جانشین بنے اور پوری زندگی اپنے آبا واجداد کے طریق پر عمل پیرا رہے اور لوگوں کو راہِ ہدایت کی رہنمائی کرتے رہے۔

صاحبِ مناقب غوثی نے سال کی تعیین کے بغیر ان کی تاریخ وفات ۲۲ جمادی الاولیٰ لکھی ہے۔

شیخ چاند [اول]

شیخ معروف کے بیٹے شیخ چاند تھے، جنھوں نے والد کے بعد ان کی جگہ سنبھالی۔ یہ بھی اپنے عالی قدر والد کی طرح اپنے آبا واجداد کے طریق پر قدم بہ قدم رہے۔

شیخ چاند کے دو فرزند تھے، ایک شیخ محمد ماہ اور دوسرے قاضی منجھن۔ قاضی منجھن جون پور میں عہدۂ قضا پر مامور تھے، اس لیے ان کی زندگی کے بیشتر ایام جون پور ہی میں گزرے۔

قاضی منجھن کے صاحب زادے شیخ محمود مشہور فلسفی عالم ملا محمود کے پردادا ہیں۔ شیخ محمود کے بیٹے شیخ بڑے تھے، یہ بڑے جاہ وحشم اور فہم وفراست کے مالک تھے۔ ان کا مزار ولید پور میں ہے اور بڑے صاحب کے مزار کے نام سے جانا جاتا ہے۔

شیخ بڑے کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام بالترتیب یہ ہیں: شیخ محمد، شیخ مشید، شیخ قطب الدین، شیخ حافظ، شیخ عبدالحق۔ شیخ محمد۔ آخر الذکر ملا محمود کے والد ہیں۔ ان کا

انتقال ۲ ربیع الاول ۱۰۲۷ھ [۸] (۱۸- اکتوبر ۱۷۹۲ء) کو ہوا۔ [۹]

شیخ محمد ماہ

شیخ چاند کے بیٹے شیخ محمد ماہ تھے۔ والد کی زندگی میں یہ بڑے تنعم و ترفہ کی زندگی بسر کر رہے تھے، مگر والد کی وفات کے بعد دنیا کے لذائذ سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنے اجداد کے طریق کے احیا میں مکمل احتیاط اور کامل دل جمعی کے ساتھ لگ گئے۔ صاحبِ مناقب نے سال کی تعیین کے بغیر ان کی تاریخ وفات ۱۲ رجب لکھی ہے۔

شیخ محمد ماہ کے دو بیٹے تھے: شیخ محمد چاند [ثانی] اور شیخ محمد عثمان۔ شیخ محمد چاند ایک طویل مدت تک خانوادۂ فاروقی کے امیر و سربراہ رہے۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹے کا نام شیخ بھیکہ ہے۔

شیخ محمد عثمان

شیخ محمد عثمان شیخ محمد ماہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے امانتِ سہروردیہ کی حفاظت میں پوری زندگی بسر کی اور اپنے احوال کی ترقی کے لیے مسلسل مجاہدہ کرتے رہے۔

صاحبِ مناقب غوثی نے سال کی تعیین کے بغیر ان کی تاریخ وفات ۲۵ جمادی الثانیہ لکھی ہے۔

شیخ معروف [ثانی]

شیخ محمد عثمان کے صاحب زادے شیخ معروف [ثانی] تھے۔ یہ بڑے صاحبِ خیر و برکت انسان تھے۔ ورع و احتیاط میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اللہ کا خصوصی فضل ان پر یہ تھا کہ ان سے برکتوں کا ظہور کثرت سے ہوتا تھا۔

صاحبِ مناقب غوثی نے سال کی تعیین کے بغیر ان کی تاریخ وفات ۱۶ ذی قعدہ لکھی ہے۔

شیخ ابوسعید

شیخ معروف [ثانی] کے صاحب زادے شیخ ابوسعید تھے۔ بڑے بلند ہمت اور عالی مقام انسان تھے۔ ان کا نام شیخ ابوسعید پڑنے کی وجہ یہ ہوئی کہ پیدایش کے بعد جب ان کے والد شیخ معروف کو بیٹے کی پیدایش کی خوش خبری سنائی گئی تو وہ اس وقت تصوف کی کسی کتاب کا مطالعہ کررہے تھے۔ نام تلاش کرنے کے لیے کتاب میں غور کیا تو مشہور صوفی شاعر بزرگ ابوسعید ابوالخیر کا نام سامنے آیا۔ فرمایا کہ اس کا نام ابوسعید ہے اور اس کی صلب سے ایک لڑکا پیدا ہوگا، اس کا نام ابوالخیر ہوگا۔

صاحبِ مناقب غوثی نے سال کی تعیین کے بغیر ان کی تاریخ وفات ۱۲ ذی الحجہ لکھی ہے۔

شیخ حاجی ابوالخیر

شیخ حاجی ابوالخیر اپنے وقت کے جید علما میں شمار ہوتے تھے۔ علومِ عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے، سیر وسلوک میں انتہائی بلند مقام کے حامل تھے۔ جلال الدین محمد اکبر [۱۵۴۲ء-۱۶۰۵ء] کے اخیر دورِ حکومت میں ۱۰۰۸ھ [۱۵۹۹ء] میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ اوپر گذرا کہ آپ کا نام ولادت سے پہلے ہی دادا شیخ معروف نے متعین کر دیا تھا۔ لہٰذا دادا کے متعین کردہ نام کی تعمیل میں ابوالخیر نام رکھا گیا۔ کم عمری ہی میں علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کر لی اور نوجوانی کی دہلیز پر پہنچے تو حضرت سید شیر محمد برہان پوری [۱۰] کے حلقۂ ارادت منداں سے وابستہ ہو گئے۔

شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں دہلی آ گئے، دہلی میں آپ کے علم وصلاحیت کا خوب شہرہ وچرچا ہوا۔ امیر الامرا نواب شایستہ خان [۱۰] بے حد عقیدت کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، فارغ اوقات میں مختلف علوم مثلاً احادیث، تفسیر اور طبقۂ صوفیہ کے اصطلاحات ورموز سیکھنے کی کوشش کرتا۔

نواب شایستہ خان بادشاہ شاہ جہاں [۱۵۹۲ء-۱۶۶۶ء] کی خدمت میں شیخ ابوالخیر کا

ذکر بلند الفاظ میں کرتا، جس سے بادشاہ بھی ملاقات کا مشتاق ہوگیا۔ نواب شایستہ خان نے ملاقات کا نظم کیا اور بادشاہ شیخ ابوالخیر سے مل کر بے حد خوش ہوا اور اپنے قریبی علما میں شامل کرلیا۔ مقرب بنانے کے بعد شاہ جہاں نے کئی مرتبہ شیخ ابوالخیر کے سامنے منصب کی پیش کش کی، مگر آپ نے ہر مرتبہ انکار کردیا۔ بالآخر گزر اوقات کے لیے چند دیہات بہ طور نذر قبول کرنے کی درخواست کی، مگر شیخ اپنے انکار پر قائم رہے اور توکل وتفویض کے شیوہ سے ہٹنا گوارہ نہیں کیا۔

شاہ جہاں ایک مرتبہ حضرت میاں میر [۱۲] سے ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت میاں میر اس وقت سیال کوٹ میں سکونت پذیر تھے۔ شاہ جہاں کے ساتھ شیخ ابوالخیر بھی تھے۔ ملاقات کے بعد بادشاہ نے ان کی خدمت میں کچھ نقد نذر کرنا چاہا، مگر انھوں نے انکار کردیا۔ جب بادشاہ کا اصرار بڑھا تو شیخ ابوالخیر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ 'اس ہدیے کے زیادہ لائق یہ ہیں، طرح طرح کی مشقت اٹھا کر علم حاصل کیا اور اب حصولِ آبرو کے لیے اس کو بے جا صرف کر رہے ہیں۔' حضرت میاں میر کی یہ بات شیخ ابوالخیر کے دل میں ترازو ہوگئی اور اسی وقت عزم کرلیا کہ بادشاہ کی مصاحبت ترک کردیں گے اور دنیا سے بالکلیہ قطعِ تعلق کرلیں گے۔

ترکِ مصاحبت اور انقطاعِ دنیا کے بعد میدانِ سیر وسلوک کا پھر سے رخ کیا اور سخت ریاضات ومجاہدات کیے اور استغنا کے اس بلند مقام پر فائز ہوئے کہ پھر کسی طرف توجہ نہیں کی۔ اسی درمیان حج بیت اللہ کا داعیہ پیدا ہوا تو بے زاد وراحلہ بیت اللہ کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ نواب شایستہ خان کی والدہ ایک پارسا، صالحہ اور انتہائی محتاط ومتقی خاتون تھیں۔ بیٹے کے پاس جاہ ومنصب اور دولت کی ریل پیل تھی، مگر وہ اپنے گزر اوقات کا انتظام چرخہ چلا کر خود کرتی تھیں، اس سے جو آمدنی ہوتی، اسے اپنی ضروریات میں استعمال کرتیں اور جو رقم ضرورت سے زائد ہوتی، اسے پس انداز کرلیتیں۔ ان کو جب شیخ ابوالخیر کے سفر حج کی اطلاع ملی تو پس انداز کی ہوئی رقم اس درخواست کے ساتھ بہ طور ہدیہ بھیجیں کہ 'یہ حلال طریقے سے کمائی ہوئی رقم ہے، اگر قبول ہوجائے تو عزت وشرف کی بات ہو۔' مگر شیخ ابوالخیر نے استقلال کا مظاہرہ کیا اور اس پاک باز خاتون کی رقم بھی قبول کرنے سے انکار کردیا۔

حج بیت اللہ کے لیے جب شیخ ابوالخیر نکل پڑے تو نواب شایستہ خان نے درخواست

بھجوائی کہ 'اس قدیم خادم کا تجارتی جہاز بیت اللہ کے راستے میں ہے، حکم ہو تو جہاز کے خادموں کو تاکید کردوں، حضرت اسی جہاز سے سفر کریں۔' شیخ ابوالخیر نے اس کی درخواست کو سن کر عزیمت و محبت میں ڈوبا ہوا یہ جملہ ارشاد فرمایا:

''وائے بر ہمت وے کہ در راہِ دوست وسیلہ غیر درمیاں آرد۔'' [۱۳]

افسوس ہے اس شخص کی ہمت پر جو دوست کے راستے میں غیر کا وسیلہ درمیان میں لائے۔

یہ کہہ کر اس کی درخواست نظر انداز کردی۔

۱۰۵۶ھ [۱۶۴۶ء] میں حرمین شریفین کی زیارت کر کے واپس ہندستان آئے اور دہلی یا برہان پور جانے کی بجائے سیدھے ولید پور تشریف لائے۔ اب ان کی ہیئت اور لباس و پوشاک بدل چکی تھی۔ جب ولید پور سے نکلے تھے تو شاہانہ ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ نکلے تھے، مگر واپس آئے تو درویشانہ لباس میں۔ کچھ دنوں ولید پور میں سکونت رکھی، اس کے بعد وہاں کی بھیڑ بھاڑ سے یک سوئی حاصل کرنے کے لیے سلطان پور بھیرا آ گئے۔ موجودہ گاؤں سے پچھّم کی طرف دریاے ٹونس کے کنارے ایک پُرفضا مقام پر اقامت گزیں ہوئے اور پھر وہیں خانقاہ اور ضرورت کے مکان وغیرہ بھی تعمیر کر لیے۔

شیخ ابوالخیر کی تین شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی چریاکوٹ شیخ عبداللہ کی دختر سے ہوئی تھی۔ شیخ عبداللہ چریاکوٹ کے مشہور شیخ طریقت شیخ اسماعیل چریاکوٹی کی اولاد میں سے تھے۔ شیخ عبداللہ کی دختر کے بطن سے مخدوم شاہ اسماعیل متولد ہوئے۔ دوسری شادی ملا محمود جون پوری کی بہن یعنی شیخ محمد کی بیٹی سے ہوئی تھی، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تیسری شادی شیخ محمود قریشی المعروف بہ بایسی مبارک پوری کی دختر سے ہوئی اور ان سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

زندگی کے آخری ایام میں شیخ ابوالخیر فراق و وصال کی باتیں کثرت سے کرنے لگے تھے، شاید انھیں محسوس ہو گیا تھا کہ زندگی کے ایام اب کم بچے ہیں۔ گھر کے باہر صحن میں ایک برگد کا درخت اُگ آیا تھا جو انتہائی سایہ دار اور مناسب مقام پر تھا۔ شیخ نے اخیر ایام میں اسی کے نیچے ایک چبوترہ بنا لیا تھا جس پر اذکار و اوراد کے لیے اور کبھی کبھی ہم عمروں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔

۱۰-شوال ۱۰۵۹ھ [۱۷-اکتوبر ۱۶۴۹ء] کو اپنے کچھ ہم عمروں کے ساتھ چبوترے پر کھڑے تھے، ہاتھ میں عصا تھا، عصا سے چبوترے پر لکیر کھینچ کر قبر کی شکل بنائی۔ اس کے بعد گھر پہنچے تو طبیعت میں اضمحلال کا اثر محسوس کیا اور کچھ حرارت سی بھی ہوگئی۔ بیماری ایسی نہیں تھی کہ کسی کو تشویش ہوتی مگر چند گھنٹوں کے بعد اسی حرارت میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کے بعد چبوترے پر جو قبر کی شکل بنائی تھی، اس کی طرف لوگوں کا دھیان گیا اور ان کے فرزند شیخ اسماعیل سے لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ شیخ اسماعیل نے جب لکیر دیکھی تو انھیں شرح صدر ہوگیا کہ یہ لکیر در اصل یہیں قبر بنانے کی وصیت ہے۔ لہٰذا وہیں قبر کھودی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ [۱۴]

مخدوم شیخ ابوالخیر نے ۵۱ سال حیات پائی اور بھر پور زندگی بسر کی۔ اسی مختصر عمر میں بادشاہ کی مصاحبت بھی کی اور حج بیت اللہ سے بھی سرفراز ہوئے جو اس زمانے میں ایک نادر عمل تھا۔ تصنیف و تالیف سے بھی شغف رکھا۔ اپنے خاندان کے بزرگوں کے احوال لکھے، حرمین شریفین کی تاریخ اور سفر حج اور حج سے متعلق مسائل ومباحث لکھے۔ یہ ساری چیزیں ان کی ایک قلمی کتاب شیر وشکر میں ہے، جو اب تقریباً نایاب ہوچکی ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے کتاب کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس موضوع پر شاید یہ پہلی کتاب تھی جو اس دیار میں لکھی گئی۔'' [۱۵]

شیخ اسماعیل

شیخ اسماعیل کی ولادت ۲۲ رمضان المبارک ۱۰۳۴ھ [۲۸ مئی ۱۶۲۵ء] کو ہوئی۔ اس زمانے کی مروجہ ترتیب کے مطابق تحصیل علوم میں لگے اور کم عمری ہی میں علومِ عقلیہ ونقلیہ سے رسمی فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد برہان پور اپنے والد کے مرشد حضرت سید شیر محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ چوں کہ جوہر قابل تھے، اس لیے مرشد کی ایک نگاہِ توجہ کام کرگئی۔ خرقۂ خلافت حاصل ہونے کے بعد بھی مرشد ہی کی خدمت میں رہے۔ راہِ سلوک میں اتنی ترقی کرلی تھی کہ مرشد کے پاس کوئی طالب آتا تو شیخ اسماعیل سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے یا اگر کسی کو بیعت کر لیتے تو تربیت کے لیے شیخ اسماعیل کے سپرد کر دیتے۔

صاحبِ مناقب غوثی نے ایک روایت یہ بھی ذکر کی ہے کہ جن ایام میں شیخ اسماعیل برہان پور میں قیام پذیر تھے، ان دنوں شاہ زادہ اورنگ زیب عالم گیراس دیار کا منتظم تھا۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب حضرت میر سید شیر محمد کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلطنتِ دہلی پر اپنے استحکام کی دعا چاہی۔ حضرت میر سید شیر محمد نے اسے شیخ اسماعیل کے پاس دعا کرانے کے لیے بھیج دیا۔ وہ شیخ اسماعیل کے پاس آیا، مدعا عرض کیا تو شیخ نے اسے بشارت سنائی جو بعد میں چل کر سچ ثابت ہوئی۔[۱۶]

اورنگ زیب عالم گیر جب سریر آرائے سلطنت ہو گئے تو انھیں شیخ اسماعیل کی یاد آئی۔ حضرت میر سید شیر محمد کی خدمت میں عریضہ لکھ کر شیخ اسماعیل کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ عریضہ پہنچنے سے کچھ روز پہلے ہی شیخ اسماعیل برہان پور سے وطن کے لیے لوٹ چکے تھے۔ میر سید شیر محمد نے بادشاہ کو جوابی عریضے میں شیخ اسماعیل کے یہاں سے کوچ کرنے کی اطلاع دی اور ان کی گزر گاہوں کی بھی نشان دہی کر دی، تاکہ بادشاہ ان میں سے کسی جگہ اپنا آدمی بھیج کر ان کو دہلی بلوا سکے۔ بادشاہ نے خان جہاں بہادر ناظم الہ آباد کو خط لکھا کہ شیخ اسماعیل الہ آباد سے گزریں گے، ان سے ملاقات کر کے جیسے بھی ہو، انھیں دہلی آنے پر آمادہ کرو۔ ناظم الہ آباد نے بادشاہ کا پیغام پہنچایا اور دہلی جانے پر بہت اصرار کیا، مگر شیخ اسماعیل نے اس کی درخواست کی طرف سرے سے التفات ہی نہیں کیا۔ سیدھے آستانہ بھیرا آئے اور یادِ خدا میں مشغول ہو گئے۔[۱۷]

شیخ ابوالخیر کے تذکرے میں گزر چکا ہے کہ نواب شایستہ خان ان کا کیسا معتقد و مداح اور نیازمند تھا۔ شیخ ابوالخیر کی وفات کے بعد اس کی یہ نیازمندی بیٹے یعنی شیخ اسماعیل کی طرف منتقل ہو گئی۔ شیخ اسماعیل سے ملاقات کے لیے کبھی کبھار بھیرا آیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ نواب شایستہ خان بھیرا آیا ہوا تھا اور شیخ اسماعیل کی خدمت میں حاضر تھا۔ شیخ استغراقی کیفیت میں تسبیح ہاتھ میں لیے گھما رہے تھے، اسی دوران شیخ کا تسبیح والا ہاتھ نواب شایستہ خان کی طرف بڑھا، اس نے سمجھا کہ مجھے تسبیح عطا ہو رہی ہے، فوراً ادب سے سروقد کھڑا ہو گیا۔ شیخ اسماعیل نے دیکھا تو جھڑک کر کہا کہ 'بیٹھو! میں تمھیں دے نہیں رہا ہوں۔' نواب کے چہرے پر ندامت کا ایک رنگ آکر چلا گیا۔ اس مجلس میں شیخ اسماعیل کے صاحب زادے شیخ محمد شاہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے

نواب کی شرمندگی کو محسوس کر لیا۔ رات میں شیخ محمد نے تسبیح والی بات کا تذکرہ تنہائی میں چھیڑا اور عرض کیا کہ اگرچہ آپ نے تسبیح دینے کا ارادہ نہیں کیا تھا، مگر جب وہ اعتقاد میں کھڑا ہو گیا تھا تو پھر دے دینا ہی مناسب اور بہتر تھا۔ اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کل جب نواب شایستہ خان آپ کی خدمت میں حاضر ہو تو اسے یہ تبرک عطا فرما دیجیے گا۔

دوسرے دن جب نواب شایستہ خان خدمت میں حاضر ہوا تو شیخ اسی استغراق میں بیٹھے تسبیح گھما رہے تھے، نواب کو دیکھا تو تسبیح والا ہاتھ آگے بڑھایا، مگر کل کے حادثے کی وجہ سے نواب کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ شیخ اسماعیل نے جب اسے ساکت و ساکن کھڑا دیکھا تو فرمایا کہ 'لے لو! درویش کے اس ہدیے کو تبرک سمجھ کر رکھ لو، اس سے بڑی برکتیں حاصل ہوں گی۔' نواب شایستہ خان تعظیم کے ساتھ آگے بڑھا، تسبیح لی اور اسے سر آنکھوں سے لگایا۔

اس کے بعد شیخ اسماعیل نے فرمایا کہ 'میں کیا کروں؟ رات میرے بیٹے محمد شاہ نے اس سلسلے میں بڑی شکایت کی، اس کی دل جوئی کے لیے میں تم کو دے رہا ہوں۔'[۱۸]

شیخ اسماعیل اپنے بیٹے محمد شاہ کا بے حد لحاظ کرتے تھے اور انھیں کسی گھریلو اور زمینی انتظام میں کبھی روکتے یا ٹوکتے نہیں تھے۔ شیخ اسماعیل پر عموماً جذب و استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی، بعض اعزا جو شیخ محمد سے بغض رکھتے تھے، شیخ اسماعیل کی اس کیفیت کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ جب ان کو استغراق و جذب کی حالت میں باہر کہیں بیٹھا پاتے تو گھریلو اور انتظامی معاملات کو لے کر شیخ محمد کی شکایت کرتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا کہ اس کیفیت میں ان کو غصہ آجائے اور شیخ محمد کو برا بھلا کہیں یا ان سے اختیارات سلب کر کے ہم لوگوں کو دے دیں، مگر شیخ اسماعیل اس کیفیت میں بھی شیخ محمد کا لحاظ کرتے اور ان پر اعتماد کا اظہار کرتے اور کبھی ان کو ٹالنے کے لیے بس اتنا کہہ دیتے کہ 'ٹھیک ہے، میں ان چیزوں سے انھیں منع کروں گا۔'

شیخ محمد بھی اپنے والد کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے، ان سے استغراقی اور جذبی کیفیت میں بسا اوقات ایسے اعمال سرزد ہو جاتے جو نقصان کا باعث ہوتے، مگر شیخ محمد سارے نقصانات کو بہ خوشی برداشت کر لیتے۔

شیخ اسماعیل گرمیوں میں عموماً ستر پوشی کے بہ قدر کپڑا پہنتے تھے، شیخ محمد اصرار کر کے کپڑا

پہناتے تو پہن لیتے، مگر جب باہر جاتے اور کوئی برہنہ مل جاتا تو اپنا کپڑا اتار کر اسے دے دیتے۔ سردی میں شیخ محمد اہتمام سے ان کے لیے قبا سلاتے اور اصرار کر کے پہناتے۔ قبا کا حال یہ ہوتا کہ ایک موسم میں درجنوں قبائیں شیخ محمد کو سلوانی پڑتیں، کیوں کہ شیخ اسماعیل قبا پہن کر باہر نکلتے اور جہاں کوئی مفلوک الحال سردی سے ٹھٹھرتا ہوا ملتا، اسے دے آتے۔ بعد میں شیخ محمد نے یہ تدبیر کی کہ جب نئی قبا پہناتے تو کہہ دیتے کہ یہ قبا میری ہے، اس لیے اتارنے کے بعد مجھے عنایت کیجیے گا۔ شیخ اسماعیل ان کی اس بات کا لحاظ کرتے اور کوئی مفلوک الحال ملتا تو افسوس کرتے کہ یہ قبا میرے بیٹے کی ہے، ورنہ میں تمھیں دے دیتا۔

شیخ محمد ایک قبا اتارتے تو اسے بہ طور تبرک بکسے میں حفاظت کے ساتھ رکھ دیتے۔ چنانچہ شیخ اسماعیل کی ایک سبز رنگ کی قبا بہ طور امانت وتبرک شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے پاس بھی تھی۔ شیخ شمس الدین حیدری نے لکھا ہے کہ میں نے اس قبا کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔ اس قبا کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اسماعیل میانہ قد اور دبلے پتلے جسم کے تھے۔[۱۹]

شیخ اسماعیل کبھی رو میں آتے تو رعایا اور کسانوں کی دیکھ بھال کے لیے ان کے گھروں یا کھیتوں کی طرف چلے جاتے اور دیگر سوالات کے ساتھ یہ ضرور پوچھتے کہ 'میرے بیٹے محمد شاہ کو محصول دیتے ہو؟' اگر کوئی کسان ان کے سامنے سے گزرتا تو اسے بھی بلا کر یہ سوال کرتے۔ شیخ محمد نے کسانوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ والد ماجد جب محصول کے بارے میں پوچھیں تو ان سے کہنا کہ 'ہم لوگ سرکار کے لوگوں کو زمین کا کوئی محصول نہیں دیتے ہیں، سارے محصول معاف اور زمینیں مرفوع القلم ہیں۔ جس کے ذمے جو زمین ہے، اس سے وہ اپنے معاش کا انتظام کرتا ہے۔' جب شیخ اسماعیل کسانوں سے یہ رٹا رٹایا جواب سنتے تو خوش ہوتے اور کہتے کہ 'صحیح ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے۔ زمین خدا کی ملکیت ہے، اپنے متعلقین کے ساتھ تم لوگ اس پر متصرف رہو۔'

شیخ اسماعیل بڑے بارعب اور پُر ہیبت انسان تھے، مزاج میں جلال بہت تھا۔ کوئی اجنبی شخص ملنے کے لیے آتا تو اس سے بڑے جلال کے ساتھ باز پرس کرتے۔ کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ بے جھجک ان کے سامنے جانے کی ہمت کر سکے۔ ناواقف جب ملاقات کے لیے پہنچتے

تو محض ان کا جلال دیکھ کر تھرا جاتے۔

یہ ظاہری رعب داب اور جاہ وجلال شاید اس وجہ سے تھا کہ ان کے یہاں کتمانِ احوال کا بڑا اہتمام تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان سے قریب ہو اور ان کے باطنی احوال سے واقف ہو جائے۔ شاید اسی کتمانِ احوال کا غلبہ ان پر اتنا زیادہ ہوا کہ خود کو فرقۂ ملامتیہ [۲۰] میں شامل کر لیا اور اپنے کو ایسا ظاہر کرنے لگے جیسے وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ مگر اس میں وہ اعتدال وتوازن برقرار نہ رکھ سکے اور فرقۂ ملامتیہ میں شامل ہونے کے بعد قدم جادۂ مستقیم سے ہٹ گیا اور خلافِ شرع امور کا صدور ان سے ہونے لگا۔ شراب اور اس طرح کی دیگر نشہ آور چیزوں کا استعمال کرنے لگے۔ ان کے فرقۂ ملامتیہ میں شامل ہونے اور شراب نوشی کا ذکر کرتے ہوئے صاحب مناقب غوثی نے ایک واقعہ لکھا ہے:

''شیوۂ شرب دوام پیش گرفت، خود را فرقۂ ملامتیہ انداخت، در جوانب و اطراف ایں مقدمہ شہرت یافت، چنانچہ قاضیِ وقت را ناپسندیدہ آمد، نائب سلطان را بریں آورد کہ آں درویش را تعذیر رساند، ایں ارادہ را در دل متمکن ساختہ باہم قصد ملازمت نمودند، چوں بشرف ملازمت مشرف شدند می بینند کہ سبوہاے پُر از شراب در پیش داشتہ درویش در لذتِ اصلی مشغول است، اما چوں نظر بر جمال وجلالِ آں صاحب کمال افتاد، بے خود سر در قدم آوردند باد ب تمام بہ یک گوشہ در خدمت استادند، حضرت مخدوم ایں کلام بر زبان مبارک براند:

عیب رنداں مکن اے زاہد پاکیزہ سرشت
کہ گناہ دیگراں بر تو نخواہند نوشت

برسبیل تواضع قدحے پُر کردہ بقاضی مرحمت کرد، شیرے مصفا در نظر قاضی شود، بے تامل باتفاقِ رفقا تناول فرمود، زبانِ حال بایں مقال مترنم گشت۔''[۲۱]

تا بر رخ زیبائے تو افتاد زاہد را نظر
تسبیح زہدش یک طرف ماندہ مصلی یک طرف

آپ نے شراب نوشی کا شیوہ اپنائے رکھا اور خود کو فرقہ ملامتیہ میں شامل کر لیا تھا۔ اطراف وجوانب میں جب آپ کی شراب نوشی کا چرچا ہونے لگا تو قاضیِ وقت کو یہ چیز ناپسند ہوئی،

اس نے نائب سلطان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ شیخ اسماعیل کو سزا دینی چاہیے۔ یہ ارادہ کر کے دونوں ملاقات کے لیے آپ کے پاس آئے۔ جب ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ شراب سے بھرا ہوا سبو سامنے رکھا ہے اور درویش لذتِ اصلی میں مشغول ہے۔ جب ان کی نظر اس صاحبِ کمال کے جلال و جمال پر پڑی تو بے خود ہو کر سر قدموں پر رکھا اور ایک گوشے میں باادب کھڑے ہو گئے۔ حضرت مخدوم نے یہ شعر پڑھا:

عیب رنداں مکن اے زاہد پاکیزہ سرشت
کہ گناہ دیگراں بر تو نخواہند نوشت

برسبیل ضیافت ایک پیالہ بھر کر قاضی کو بھی دیا، قاضی کی نگاہ میں وہ صاف شفاف دودھ تھا۔ رفقا کی تائید پا کر اس نے بے تامل پی لیا اور زبان حال سے کہا:

تا بر رخ زیبائے تو افتاد زاہد را نظر
تسبیح زہدش یک طرف ماندہ مصلی یک طرف

صاحبِ مناقب غوثی نے تکلیفات شرعیہ کے سلسلے میں یہاں تک لکھ دیا ہے:

''آں حضرت را جذبۂ استغراق چناں در مشاہدۂ جمالِ لایزال محو و مستغرق نمودہ بود کہ از تکلیفات آداب شریعت مطلق فراغت داشت۔''[۲۲]

آں حضرت [شیخ اسماعیل] کو جذبۂ استغراق جمالِ لایزال کے مشاہدے میں ایسا محو و مستغرق کرتا تھا کہ وہ تکلیفاتِ آدابِ شرعیہ سے مطلق فراغت حاصل کر لیتے تھے۔

یہاں پر یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ صاحبِ مناقب کی یہ تاویل یا رائے غلوے عقیدت پر مبنی ہے۔ مگر یہ ہے کہ شیخ اسماعیل کے قلب میں شریعت کی بے حد تعظیم تھی اور اس کے شعائر کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اس تعظیم و لحاظ کے مظاہر کبھی کبھی لوگوں کے سامنے آتے بھی تھے۔ ایک مرتبہ تھوپور سپاہ جاتے ہوئے راستہ میں ایک ملنگ ملا جو شرعی حدود و قیود سے بے گانہ تھا۔ اس نے شیخ اسماعیل کو دیکھا تو اپنا ہم مشرب سمجھ کر بھنگ کا ایک پیالہ بہ طور تواضع پیش کیا۔ شیخ نے لے لیا اور پینے جا رہے تھے کہ اس نے کہا کہ 'یہ شربت مفرح ہے، بعض ناقص لوگ اسے حرام سمجھتے ہیں۔' شیخ اسماعیل کو اس کی یہ بات سخت ناگوار گزری، انھوں نے فوراً پیالہ زمین پر پٹک دیا اور کہا 'ایں

حرام،توحرام،پیرتوحرام۔'[۲۳]

شیخ اسماعیل کے فرزند محمد شاہ ان کی شراب نوشی اور بھنگ وغیرہ کے استعمال کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے، براہ راست تو شاید ٹوکنے یا منع کرنے کی ہمت نہیں کر سکے، مگر شیخ اسماعیل کے خدام جو جام وسبو تیار کرنے کی خدمت پر مامور تھے، جب وہ پیالہ وسبو بھر کر ان کے پاس لے جاتے اور شیخ محمد کی نگاہ پڑ جاتی تو خدام کی خوب اچھی طرح خبر لیتے اور شراب زمین پر پھینکوا دیتے۔ خدام جا کر شیخ محمد کی اس سلسلے میں شکایت کرتے تو شیخ اسماعیل کہتے کہ 'تم لوگ محمد شاہ کے سامنے شراب لانے کی گستاخی کیوں کرتے ہو، اگر لانا ہی ہے تو ان سے چھپا کر لاؤ۔ اس معاملے میں میں کچھ نہیں کر سکتا، حق پر وہی ہے، تم لوگ باطل پر ہو۔'

شیخ اسماعیل کی اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر ایسا بھی جذب واستغراق طاری نہیں ہوتا تھا کہ حق وباطل کی تمیز ختم ہو جائے۔ وہ اپنے اس عمل کو غلط سمجھتے تھے، مگر صاحبِ مناقب نے غلوے عقیدت میں ڈوب کر اس صریح خلافِ شرع عمل کی ایسی ایسی توجیہ وتاویل کی ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ صرف توجیہ وتاویل تک معاملہ رہتا تو ایک حد تک غنیمت تھا۔ شیخ اسماعیل کی بزرگی وللّٰہیت ثابت کرنے کے لیے ان کی ایسی ایسی کرامتیں بیان کی ہیں جن کی نہ توجیہ وتاویل ممکن ہے اور نہ ہی عقل انھیں قبول کرنے کو تیار ہے۔ مناقبِ غوثی میں ان کی سات بھاری بھرکم کرامتوں کا ذکر ہے جن میں سے ایک کا تعلق احیاے موتی سے بھی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کا ایک جھانگر نامی خادم تھا جو ان کا قریبی اور مزاج شناس تھا۔ ایک رات اچانک بیمار ہوا اور اسی رات فوت ہو گیا۔ صبح لوگوں نے اس کی تکفین وتدفین کر دی۔ دو تین دن تک شیخ اسماعیل کی خدمت میں نہیں پہنچا، اس کی جگہ دوسرے خدام خدمت کرتے رہے، دوسرے خدام کے قصورِ خدمت سے شیخ اسماعیل پریشان ہو گئے تو جھانگر کے بارے میں پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ شیخ اسماعیل پر ولایتِ عیسوی کا جوش طاری ہوا، فوراً اس کی قبر کے پاس گئے، قبر کو کھولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ صاحبِ مناقب نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ شیخ اسماعیل کی وفات کے بعد بھی تھوڑی مدت زندہ رہا، اس کے بعد وفات پائی۔[۲۴]

صاحبِ مناقب نے تو ایک کرامت ایسی بھی ذکر کی ہے جس کے اشارے سے معلوم

ہوتا ہے کہ شیخ اسماعیل کے یہاں فرض نمازوں کا بھی کچھ خاص اہتمام نہیں تھا۔ شیخ محمد اسماعیل کے ایک عزیز تھے، نام تھا قاضی محمد عینی، جون پور میں رہتے تھے اور وہیں ان کی خانقاہ بھی تھی۔ ان سے جب بھی شیخ اسماعیل کی ملاقات ہوتی تو وہ اتباعِ شریعت کی فہمایش کرتے اور نمازِ پنج گانہ کی تاکید کرتے۔ ایک مرتبہ شیخ اسماعیل قاضی عینی کے ساتھ ان کی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ قاضی محمد عینی اٹھے اور درخواست کی کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، آپ امامت کر دیجیے، تاکہ جماعت سے نماز ادا کر لی جائے۔ شیخ اسماعیل نے نماز پڑھانی شروع کی اور بہ قول شیخ شمس الدین حیدری مشاہدۂ جمالِ حق میں ایسا مستغرق ہوئے کہ رکوع کیا ہی نہیں۔ مقتدیوں نے بساط بھر انتظار کیا پھر نماز توڑ دی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ تین رات نماز میں کھڑے رہے۔ [۲۵]

شیخ اسماعیل کی وفات ۱۶ جمادی الاولی ۱۱۰۶ھ [۲ جنوری ۱۶۹۵ء] بہ روز چہار شنبہ ۷۲ برس کی عمر میں ہوئی۔ وفات سے پہلے کئی طرح کی بیماریوں نے جسم کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ وفات کے دن چاشت کے وقت اپنے فرزند محمد شاہ کو بلایا اور جو کچھ خاندانی تبرکات، خرقے اور پیروں کی امانتیں تھیں، انھیں محمد شاہ کے سپرد کیا، حفاظت کی تاکید کی اور کہا کہ جب بھی ضرورت ہو، انھیں کام میں لانا اور ان کے حفظِ مراتب کا پورا خیال رکھنا۔

اس کے بعد پشت کے سہارے سے شیخ اسماعیل کو قبلہ رو بٹھایا گیا۔ بیٹھنے کے بعد تیمم کیا اور نماز میں مصروف ہو گئے۔ پہلی رکعت کے سجدے سے اٹھ رہے تھے کہ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا، سر تکیے سے جالگا اور جان جاں آفریں کے حوالے کر دی۔ بھیرا میں اپنی حویلی کے دروازے پر اپنے والد بزرگوار شیخ ابوالخیر کی قبر کے برابر میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

صاحبِ مناقب کی روایت ہے کہ چہار شنبہ کی رات [جس کی صبح شیخ اسماعیل کا انتقال ہوا تھا] میں اس دیار میں ایک صاحبِ حال درویش کا ورود ہوا تھا، انھوں نے اپنے مراقبے میں دیکھا کہ تمام مقربانِ بارگاہ جوق در جوق تیزی سے ایک سمت چلے جا رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا تو جواب ملا کہ شیخ اسماعیل اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں، ان کی نمازِ جنازہ ادا کرنے لیے ہم لوگ جا رہے ہیں۔ صبح وہ درویش بھی آستانہ بھیرا کی طرف چل پڑے اور شیخ اسماعیل کی تکفین و

تدفین اور جنازہ میں شریک ہوئے۔[۲۶]

حوالے وحواشی

۱- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۱۶۰، ۱۶۱

۲- قاضی اطہر مبارک پورصاحب نے لکھا ہے:

''اس خانوادے کے جد امجد شیخ خضر اور ان کے صاحب زادے شیخ محمد دہلی سے جون پور تشریف لائے۔''[دیار پورب میں علم اور علما: ۳۱۳]

مگر صاحبِ مناقب غوثی نے لکھا ہے:

''مزار مبارکہ او[شیخ خضر] در شہر دہلی حاجت روای خلق است۔ الغرض حضرت مخدوم شیخ محمد از دہلی بسبب خاطر برداشتہ شد در وقت سلطان ابراہیم شرقی معہ احمال واثقال ومتعلقان وعیال در شہر جون پور تشریف آوردہ در گوشہ ویرانہ کہ الآن بحلہ سپاہ مشہور است استقامت گرفت۔''
[مناقب غوثی، ص ۱۶۱]

ان[شیخ خضر] کا مزار مبارک دہلی میں حاجت روائے خلق ہے۔ الغرض شیخ محمد کسی سبب سے دہلی سے دل برداشتہ ہو گئے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانے میں ساز وسامان اور متعلقین وعیال کے ساتھ جون پور تشریف لائے اور ایک ویرانے میں جو کہ اب محلہ سپاہ کے نام سے جانا جاتا ہے، اقامت گزیں ہوئے۔

۳- قاضی نصیر الدین گنبدی دہلی سے جون پور وارد ہوئے تھے، قاضی عبد المقتدر دہلوی کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے بڑے اچھے علمی مراسم رکھتے تھے۔ ملک الشرق کے عہد میں جون پور میں عہدۂ قضا پر فائز تھے، بادشاہ کی نظر عنایت ان پر بہت تھی۔ اخیر عمر میں ہر طرح کے دنیاوی امور سے قطع تعلق کر لیا اور ایک گنبدی حجرہ میں خود کو نظر بند کر لیا۔ شاید اسی وجہ سے لفظ 'گنبدی' نام کا جز بن گیا۔ ۳ صفر ۸۲۷ھ [۶ جنوری ۱۴۲۴ء] کو وفات پائی اور حجرہ ہی میں موفون ہوئے۔ حجرہ اور قبر محلہ چاچک پور میں واقع ہے۔[سید اقبال احمد، تاریخ شیراز ہند، ادارہ

شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس جون پور، ۱۹۶۳ء،ص ۶۲۷]
۴- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء،ص ۳۱۴

۵- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ،ص ۱۶۵

۶- تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیاے جون پور میں سید اقبال احمد جون پوری نے شیخ محمد کی تاریخ وفات ۱۳ جمادی الاولی ۹۱۸ھ مطابق ۱۴۶۹ء [ص:۱۰۶۰] لکھی ہے جو محل نظر ہے۔ کیوں کہ شیخ محمد کی وفات ابراہیم شاہ شرقی کی زندگی ہی میں ہونا تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے اور ابراہیم شاہ شرقی کا انتقال ۸۴۴ھ مطابق ۱۴۴۰ء میں ہوا ہے۔ اس حساب سے ابراہیم شاہ کا انتقال شیخ محمد کے سامنے ہوا۔ اور پھر ۱۳ جمادی الاولیٰ ۹۱۸ھ کے مطابق میلادی تاریخ ۲۷ جولائی ۱۵۱۲ء ہوتی ہے۔ اگر ۹۱۸ھ کی بجاے ۸۱۸ھ سن وفات مان لیا جائے تو ہر اعتبار سے تطبیق درست ہو جائے گی۔ کیوں کہ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۸۱۸ھ کے مطابق میلادی تاریخ ۲۱ جولائی ۱۴۱۵ء بنتی ہے اور اس وقت ابراہیم شرقی تخت سلطنت پر متمکن تھا۔

صاحب مناقب غوثی نے شیخ محمد تاریخ وفات سال کی تعیین کے بغیر ۳ جمادی الاولی [ص:۱۶۵] لکھی ہے۔ اس اعتبار سے سید اقبال نے جو ۱۳ جمادی الاولی کی تعیین کی ہے، وہ بھی نادرست ٹھہرتی ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے بھی ۳ جمادی الاولی لکھا ہے اور سن ۸۱۱ھ [دیار پورب میں علم اور علما:ص ۳۱۴] بتایا ہے۔ یہی زیادہ قرینِ صواب ہے۔ اس کے مطابق سن میلادی ۲۴ ستمبر ۱۴۰۸ء ہوگا۔

۷- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء،ص ۳۱۷

۸- ایضاً،ص ۳۱۹

۹- تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیاے جون پور میں غالباً سہو کتابت سے ۲ ربیع الاول ۱۰۳۷ھ [ص:۱۳۴۵] درج ہو گیا ہے۔ کتاب میں یہ صراحت موجود ہے کہ والد کے انتقال کے وقت ملا محمود کی عمر بارہ سال تھی۔ ملا محمود کا سن ولادت ۱۰۱۵ھ بھی مذکور ہے۔ اگر ۱۰۳۷ھ کو درست مانیں تو انتقال کے

وقت ملامحمود کی عمر ۲۲ سال ماننی پڑے گی، جو کہ درست نہیں ہے۔ تذکرہ نگاروں نے بارہ سال کی صراحت کی ہے۔

۱۰- شیخ سید شیر محمد قادری برہان پوری شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے تھے۔ اپنے وقت کے بڑے صاحبِ ورع صوفی تھے۔ بادشاہ اورنگ زیب عالم سے بڑی قربت تھی۔ شہزادگی کے زمانے میں عالم گیر کے ہاتھ میں جن دنوں دکن کا زمامِ انتظام تھا، ان دنوں شیخ شیر محمد، عالم گیر کے جلوت وخلوت کے ساتھی تھی۔ سن وفات کے سلسلے میں دو روایتیں ہیں: ایک کے مطابق محرم ۱۰۹۰ھ [فروری۱۶۷۹ء] میں وفات ہوئی اور دوسری کے مطابق ۱۰۸۲ھ [۱۶۷۱ء] میں وفات ہوئی۔ برہان پور میں مدفون ہیں۔ [مولانا عبدالحئی حسنی، نزہۃ الخواطر، مکتبہ دارعرفات، رائے بریلی، ۱۹۹۲، جلد ۵، ص ۱۸۸، ۱۸۹]

۱۱- امیر الامرا نواب شایستہ خان، یمین الدولہ آصف خان کا بیٹا تھا، اصل نام میرزا ابوطالب تھا، مگر شایستہ خان کے نام سے مشہور ومتعارف ہوا۔ عہد عالم گیری کا ہفت ہزاری منصب دار جو امیر الامرا کے خطاب سے نوازا گیا۔ عہد شاہ جہانی و عالم گیری میں ہندستان کے مختلف صوبے اس کے زیر انتظام رہے۔ خاص طور سے بنگالہ ایک طویل مدت تک اس کے زیر انتظام رہا۔ اخیر عمر میں آگرہ کو مستقر بنالیا تھا اور آگرہ ہی میں ۱۱۰۵ھ [۹۳ / ۱۶۹۴ء] میں انتقال کیا۔

بادشاہ شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل نواب شایستہ خان کی بہن تھی اور بادشاہ جہاں گیر کی بیوی ملکہ نور جہاں شایستہ خان کی پھوپھی یعنی اس کے والد یمین الدولہ آصف خان کی بہن تھی۔

صاحب مآثر الامرا نے شایستہ خان کی مدح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شایستہ خان جیسے عمدہ اخلاق وعادات کا امیر الامرا قریب زمانے میں کوئی دوسرا نہیں گزرا۔ اس کے پاس جو عہدے اور قوت تھی، اس کا عشر بھی اگر کسی شخص کو مل جائے تو اس کی نخوت آسمان سے باتیں کرنے لگے، مگر شایستہ خان بے حد نرم، متواضع، بردبار اور شریف و وضیع ہر شخص کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا تھا۔ کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا، لاکھوں کے صرفہ سے متعدد سرائے، مساجد اور پل وغیرہ تعمیر کرائے، مسکینوں اور بے نواؤں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ انتظامی معاملات میں بے حد مستعد اور باریک بین تھا۔ [نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خان، مآثر الامرا، جلد دوم، ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ، طبع: ۱۸۹۰ء، ص ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵]

۱۲- میاں میر کا وطنی تعلق ملتان کے تعلقہ سیہوان سے تھا۔ نوجوانی ہی میں لاہور آگئے تھے۔

بڑے صاحبِ کمال بزرگ تھے۔طبیعت میں استغنا بہت تھا، حکام اور امرا کو دیکھ کر ان کی طبیعت منغض ہو جاتی۔ اخفائے حال کا ان کے یہاں بڑا اہتمام تھا، چالیس سال گم نامی کی زندگی بسر کی، پھر اللہ نے چاہا تو ان کے کمالات کا ظہور ہونا شروع ہوا اور خلق خدا میں ان کا شہرہ پھیلا۔

شاہ جہاں بادشاہ میاں میر کے عقیدت کیشوں میں سے تھا۔ دو مرتبہ ان سے ملاقات کے لیے خدمت میں حاضر ہوا، مگر میاں میر نے قطعاً اس کی طرف التفات کیا اور نہ اس کی تعظیم وتکریم کی۔ ان کی اسی بے نیازی کی وجہ سے شاہ جہاں ان کا اور گرویدہ وشیدا بن گیا۔[خافی خاں نظام الملک، مترجم: محمود احمد فاروقی، منتخب اللباب، حصہ دوم، دور شاہ جہانی، فرید بک ڈپو دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۰]

۱۳- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۱۶۹

۱۴- ایضاً، ص ۱۶۷ تا ۱۷۲

۱۵- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۴۳۶

۱۶- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۱۷۲

۱۷- ایضاً، ص ۱۷۳

۱۸- ایضاً، ص ۱۸۰، ۱۸۱

۱۹- ایضاً، ص ۱۸۴

۲۰- ''ملامتیہ'' فقرا کے ایک فرقے کا نام ہے۔ اس فرقے کے لوگ خفیہ عبادت کرتے ہیں اور اپنا ظاہر بالکل خراب رکھتے ہیں، تاکہ لوگ ان کی ملامت کریں اور برا بھلا کہیں۔

۲۱- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۱۷۳، ۱۷۴

۲۲- ایضاً، ص ۱۸۵

۲۳- ایضاً، ص ۱۸۵، ۱۸۶

۲۴- ایضاً، ص ۱۸۶

۲۵- ایضاً، ص ۱۸۴، ۱۸۵

۲۶- ایضاً، ص ۱۸۷

◆ ◆ ◆

والدین

شیخ محمد شاہ

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے والد کا نام محمد تھا، شیخ محمد شاہ کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے والد شیخ اسماعیل شاہ نے چوں کہ خود کو فرقۂ ملامتیہ سے منسلک کر رکھا تھا اور ان پر جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی، اس لیے زمین داری اور دیگر معاملات کی دیکھ ریکھ شیخ محمد شاہ کرتے تھے۔ شیخ محمد شاہ کی ابتدائی زندگی بڑے تنعم و ترفہ میں گزری ہے، حشم و خدم اور مال و منال کی ریل پیل تھی۔ خاندانی وجاہت و وراثت سے انھیں وافر حصہ ملا تھا۔ جود و سخا، بذل و عطا اور مسکین نوازی و غربا پروری میں پیش پیش رہتے تھے۔

تصوف و سلوک کا مرجع و مرکز چوں کہ ان کا خاندان ہی تھا، اس لیے اصطلاحاتِ صوفیہ اور تصوف کی باریکیوں سے علمی اعتبار سے واقف تھے، مگر عملاً ابتدائی زندگی میں اس سے دور تھے۔ والد شیخ اسماعیل کی وفات کے بعد ان کے دل کی دنیا میں تبدیلی آئی اور تنعم و تحشم چھوڑ کر تصفیۂ باطن اور تزکیۂ قلب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں عروج و کمال حاصل کیا۔

ان کے ترک دنیا کا ایک سبب یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ والد کے انتقال کے بعد شیخ بھوج بن شیخ محمد ماہ جون پوری کے بیٹے شیخ فرید کی شادی میں شرکت کے لیے مگہر جانا ہوا، اس شادی میں جون پور کے بڑے بڑے اعیان و اشراف نے شرکت کی تھی، شیخ بھوج کے ساتھ ان کا انتہائی قرابت کا تعلق بھی تھا۔ شیخ محمد شاہ کی آمد مگہر میں اغنیا و امرا کے انداز میں ہوئی تھی، حشم و خدم اور ہٹو بچو کے نعرے کے ساتھ۔ مگہر میں شیخ کبیر [۱] کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوئے اور اپنے بزرگوں کے طرز پر کچھ دیر کے لیے مراقب ہوئے تو دورانِ مراقبہ شیخ کبیر کی طرف سے انھیں

ہدایت ملی کہ امرا و اغنیا کا شیوہ چھوڑ دو اور تارکین و مجردین کے زمرے میں شامل ہو جاؤ۔

اس ہدایت کے بعد ان کی کایا پلٹ ہوگئی، واپس بھیرا پہنچے تو تزک و احتشام کے سارے اسباب کو یک لخت چھوڑ دیا اور اہل تصوف کی سی زندگی بسر کرنے لگے۔ جب زندگی کا رخ بدلا تو بزرگوں کی زیارت اور ان کے مزارات سے کسبِ فیض کا داعیہ دل میں جاگا۔ ایک رات گھر والوں کی لاعلمی میں سامانِ سفر تیار کیا اور کہاروں کو بلا کر بالکل اندھیرے منھ بنارس کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے وہ خدام اور ملازمین جو عموماً اسفار میں ان کے ساتھ رہتے تھے، انھوں نے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کیا تو حکمتِ عملی اور خوش تدبیری کے ساتھ ٹال دیا۔ ان کا یہ سفر شاہ راہِ عام کو چھوڑ کر بیابان و جنگل کے راستے سے ہوا تھا۔ دریاے کوئی کے پاس پہنچے تو کہاروں کو انعام و اکرام سے نوازا اور انھیں رخصت کر کے دریا پار کیا اور احمد آباد بنارس پہنچے۔ بنارس میں زندہ بزرگوں سے ملاقات کی، مرحومین کی مزارات پر حاضری دی اور اکتسابِ فیض کیا۔

بنارس کے بعد عظیم آباد کے بزرگوں سے ملاقات کی دل میں خواہش اٹھی۔ بنارس سے نکلے تو تن تنہا عظیم آباد کا رخ کیا۔ عظیم آباد پہنچنے کے بعد دیارِ بنگال کو بھی اپنے سفر میں شامل کر لیا اور اس دیار کے زندہ و مردہ اہل اللہ سے فیض حاصل کیا، اس کے بعد وطن بھیرا واپس لوٹے۔

اس سفر میں ان کو جو فوائد و ثمرات حاصل ہوئے، اس نے ان کے ظاہر و باطن کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ وطن پہنچنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آبا و اجداد کے طریق پر کاربند ہوتے ہوئے ارشاد و سلوک کی مسند سجائی جس کا سلسلہ گذشتہ کئی سالوں سے موقوف چلا آ رہا تھا۔ طالبانِ حق کی رہنمائی کے ساتھ غریبوں، مسکینوں اور مسافروں کی دیکھ ریکھ کرتے اور اسی کو وظیفۂ حیات بنالیا۔

کچھ سال گذرنے کے بعد جب سفر کے اثرات قلب پر کچھ کم ہوتے محسوس ہوئے تو پھر سے بزرگوں کی خدمت اور ان کے مزارات پر حاضری کا خیال پیدا ہونے لگا۔ اس مرتبہ الہ آباد کا رخ کیا اور وہاں کے اہل اللہ سے فیض حاصل کیا۔ الہ آباد کے اس سفر میں کچھ جسمانی عوارض بھی پیش آئے، جس کی وجہ سے صحت خراب ہوگئی۔ ایک دن مراقب ہوئے تو اپنا حال بطرزِ دیگر دیکھا، فوراً واپسی کا سفر شروع کیا اور وطن لوٹ آئے۔

وطن پہنچنے کے بعد بیماری روز بہ روز بڑھتی رہی، مگر عوارض سے توجہ ہٹا کر طالبانِ سلوک کی رہنمائی وہدایت میں سرگرم عمل رہے۔ زیادہ وقت غربا ومساکین اور طالبانِ سلوک کے درمیان گزرتا، کبھی طبیعت زیادہ بوجھل ہوجاتی تو تفریح کے لیے جنوبی باغ کی طرف چلے جاتے۔ اس باغ کے شمال میں غیر مسلموں نے اپنی عبادت گاہ بنا رکھی تھی، جہاں ہاتھی اور گھوڑے وغیرہ کی مورتیاں نصب تھیں، جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ ایک دن اتفاق سے شیخ محمد شاہ تفریح کرتے ہوئے ادھر جا نکلے، مورتیوں کو دیکھا تو ان کی غیرتِ توحید جاگ گئی، فوراً ساری مورتیوں کو وہاں سے ہٹانے کا حکم دیا اور اس جگہ بیٹھنے کے لیے چبوترہ بنوایا جہاں کبھی کبھی جا کر بیٹھتے اور نوافل اور دیگر اوراد و وظائف پڑھتے۔ اور اس خیال سے کہ ان کی وفات کے بعد غیر مسلم پھر نہ اس جگہ کو اپنی عبادت گاہ بنا لیں، اپنے ورثہ کو وصیت کر دی کہ انتقال کے بعد انھیں اسی چبوترے کی جگہ دفن کیا جائے۔ [۲]

بیماری کی شدت روز بہ روز بڑھتی رہی، تا آں کہ ۱۵- صفر ۱۱۱۴ھ [۱۱- جولائی ۱۷۰۲ء] کو اس خاک دان ظلمانی کو الوداع کہا اور وصیت کے مطابق اسی چبوترے کی جگہ دفن کیے گئے۔ ایک بزرگ نے وفات کے بعد آپ کی تاریخ کہی 'محمد شہ بہشتی'۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

شیخ محمد شاہ اپنے والد شیخ اسماعیل کی وفات کے بعد محض آٹھ سال چند ماہ زندہ رہے۔ شیخ اسماعیل کی وفات ۱۶- جمادی الاولیٰ ۱۱۰۶ھ [۲- جنوری ۱۶۹۵ء] کو ہوئی تھی۔

والدہ اور ان کے اجداد

شیخ ابو الغوث گرم دیوان کی والدہ ماجدہ حریم عصمت کی باپردہ خاتون تھیں اور انھیں اہل اللہ اور بزرگانِ دین سے نسبت بھی حاصل تھی۔ نھو پور [سیاہ] کی رہنے والی تھیں، ان کے والد کا نام شیخ میر خان تھا۔ شیخ میر خان مرتبہ اور جاہ وحشم والے انسان تھے۔ اس علاقے کے بڑے جاگیردار اور رئیس تھے، ساتھ ہی خدا ترس اور غریب پرور بھی تھے۔ دنیاوی امور میں مشغول ہونے کے باوجود دنیا داری سے ان کا تعلق بس واجبی اور ضروری سا تھا۔ دین وشریعت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس کا اثر ان کی صاحب زادی پر بھی مکمل طور پر پڑا۔ وہ بھی احکام شریعت کی

پابندی کا مجسم نمونہ تھیں۔

شیخ عبدالحکیم صدیقی

شیخ میر خان کے جد کلاں میں ایک نام شیخ عبدالحکیم صدیقی ہے۔ یہ ابراہیم شاہ شرقی کے مقرب و منظورِ نظر تھے۔ کثیر العیال تھے، اللہ نے انھیں پندرہ بیٹوں سے نوازا تھا اور سب مختلف صلاحیت و لیاقت سے آراستہ تھے۔ شیخ عبدالحکیم صدیقی نے اپنے سارے لڑکوں کو ابراہیم شاہ شرقی کی خدمت پر مامور کر دیا تھا، سیر و شکار اور رزم و بزم کوئی موقع ایسا نہیں تھا، جب شیخ عبدالحکیم صدیقی کے بیٹوں میں سے کوئی بادشاہ کے ساتھ نہ ہو۔ بادشاہ ان کے بیٹوں کی خدمت گزاری اور باپ کی وفاداری سے بہت خوش ہوا اور اعلا منصب کے ساتھ خان کا خطاب عطا کیا اور نتھو پور اور اس کے اطراف کو ان کے تصرف میں دے دیا۔ شیخ عبدالحکیم نے بھی مکمل دیانت و محنت کے ساتھ ان پرگنوں کا انتظام سنبھالا اور ان کو خوب ترقی دی، بہت سی معطل ولایتوں کو پھر سے بادشاہ کے زیرِ نگیں کیا اور بادشاہ کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا۔

ابراہیم شرقی کے بعد سلطان حسین شرقی نے بھی شیخ عبدالحکیم کے ساتھ کرم نوازی اور الطاف و عنایت کا معاملہ باقی رکھا، مگر انقلابِ زمانہ سے سکندر لودھی نے جب سلطان حسین شرقی کو شکست دی اور جون پور پر قابض ہوا تو شیخ عبدالحکیم اور ان کے بیٹے سکندر لودھی کے دستِ آزار سے محفوظ نہیں رہ سکے اور ملک بدر کر دیے گئے۔ جلاوطنی کے بعد انھوں نے اپنے بیٹوں اور وفادار ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک فوج بہم پہنچائی اور کفار و مشرکین کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کی طرح ڈالی اور ان کے رجواڑوں کا محاصرہ کرنے لگے اور ایک محاصرے میں جام شہادت نوش کیا۔

شیخ فتح خان اولیا

شیخ عبدالحکیم صدیقی کے ایک بیٹے تھے شیخ فتح خان، یہ انتہائی متقی و متدین انسان تھے، اپنے وقت کے بے نظیر متصوف تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے ساتھ جہاد میں شرکت نہیں کی، بلکہ اس کی جگہ انھوں نے مسند احسان و سلوک آراستہ کی اور پوری زندگی بھٹکے ہوئے آہوؤں کو حرم کا پتا

بتانے میں بسر کی۔ان کا اصل نام فتح خان تھا،مگر یہ شیخ فتح خان اولیا کے نام سے مشہور ہوئے۔ [۳]

حوالے وحواشی

۱- شیخ کبیر سے ہندی کے مشہور صوفی شاعر وسنت جو کبیر داس کے نام سے مشہور ومتعارف ہیں، مراد ہیں۔زندگی کے اخیر ایام میں بنارس سے مگہر آ گئے تھے اور مگہر ہی ان کا مدفن بنا۔

بحر زخار میں ہے:

''حضرت شیخ کبیر حا یک ابتدا میں شیخ تقی بن شیخ رمضان یا شعبان سہروردی سے ارادت رکھتے تھے،اس کے بعد شیخ بھیکہ سے فیض حاصل کیا۔اتنی کثرت سے مجاہدات کیے کہ ان پر مشربِ توحید کا غلبہ ہو گیا۔اربابِ ظاہر کی ظاہر داریاں ان کی نظر بصیرت میں کھٹکتی تھیں،اس لیے انھوں نے بے لاگ لپیٹ ایسی باتیں کہنی شروع کر دیں کہ ظاہر بیں حضرات ان کی باتوں کو کفر کی طرف منسوب کرتے ،مگر اہل باطن ان کو بے ریا سمجھتے تھے۔مشربِ رندانہ ملامتیہ میں شیخ مخدوم بھیکہ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ان کی قبر سرکار گورکھ پور کے زیر تصرف قصبہ مگد [مگہر] میں واقع ہے۔

حضرت شیخ کمال بن شیخ کبیر ملامتی کو اپنے والد سے بیعت وخلافت کا شرف حاصل تھا۔ان کا بھی تعلق مشربِ ملامتیہ سے تھا، بے باکی میں یہ اپنے والد سے بھی آ گے تھے۔ والد کی وفات کے بعد گجرات چلے گئے ،وہاں حضرت شاہ عالم محبوب نبیرہ مخدوم جہانیان ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے، گجرات میں انھیں بڑی شہرت ملی۔ان کی قبر گجرات احمد آباد میں مشہور ہے۔''[شیخ وجیہ الدین اشرف ،بحر زخار، مرکز تحقیقات فارسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ،۲۰۱۱ء،جلد دوم،ص ۴۰۹]

۲- شیخ شمس الدین حیدری،مناقب غوثی،مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ،ص ۱۸۸ تا ۱۹۱

۳- شیخ شمس الدین حیدری،مناقب غوثی،مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ،ص ۲۱،۲۲

◆ ◆ ◆

ولادت، بچپن اور تعلیم

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی ولادت سے پہلے شیخ محمد شاہ کے یہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی جو انتہائی خوب صورت اور روشن جبیں تھا، مگر قضا وقدر کا فیصلہ کہ اس کی عمر بڑی مختصر رہی۔ پیدا ہونے کے کچھ ہی مہینوں کے بعد اس کی وفات ہوگئی۔ شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی دادی کا خیال تھا کہ چوں کہ لڑکا بے حد خوب صورت تھا، اس لیے اسے نظر لگ گئی اور اس دنیائے آب وگل میں زیادہ دن نہیں رہ سکا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ 'خداوندا! محمد شاہ کو کوئی بدصورت لڑکا ہی عطا فرمادے، شاید اس کی بدصورتی اس کی حیات کا سبب ہوجائے۔' دادی محترمہ کی یہ دعا قبول ہوئی اور ربیع الآخر ۱۱۰۰ھ [فروری ۱۶۸۹ء] بہ روز دوشنبہ حضرت شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی ولادت ہوئی۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کچھ زیادہ قبول صورت یا حسین نہیں تھے، واجبی سے بھی کم شکل وصورت تھی، دیکھنے والوں نے ان کی صورت کو کچھ زیادہ پسند نہیں کیا، مگر چوں کہ ایک بچے کی وفات کے بعد ولادت ہوئی تھی، اولاد کی خواہش سب کے دل میں مچل رہی تھی، اس لیے سب کی آنکھ کے تارے تھے۔ دادا محترم شیخ اسماعیل کو جب ان کی ولادت کی خبر ملی تو وہ خوشی سے بے خود ہوگئے اور جذب کے عالم میں ان کے لیے مقام قطبی اور مقام غوثی کی بشارت سنائی جس کا اثر بعد میں واضح طور سے دیکھنے کو ملا۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی والدہ کا بیان ہے کہ 'ابوالغوث کے پیدا ہونے سے پہلے میں قسم قسم کے عوارض و بیماری میں مبتلا تھی، جب وہ میرے پیٹ میں حمل کی صورت میں ظاہر ہوا تو سارے عوارض دھیرے دھیرے ختم ہوگئے اور زندگی میں خوشیاں عود کر آئیں۔ اور جب وہ پیدا

ہوا تو گھر میں ایسی رونق محسوس ہونے لگی کہ اس سے پہلے ویسی رونق نہیں دیکھی گئی تھی۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے دادا شیخ اسماعیل ان کے عہد طفولت میں زندگی کی آخری منزل میں داخل ہو چکے تھے، یہ وہ وقت تھا جب ان پر جذب کا غلبہ زیادہ رہتا تھا۔ کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے، مگر انھیں اپنے پوتے سے اس قدر لگاؤ تھا کہ جب دایہ ان کو گود میں اٹھائے شیخ اسماعیل کے حجرے کے پاس پہنچتی اور باہر سے آواز لگاتی کہ نور دیدہ، قرۃ العین ابوالغوث قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ہے تو فوراً ان کو افاقہ ہو جاتا اور اپنے پوتے کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اسے گود میں لے کر طرح طرح سے کھلاتے، انھیں غوث ابوالغوث، اقطاب ابوالغوث، ابدال ابوالغوث کی لوری سناتے۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان جب چھ سال کے ہوئے تو ان کے دادا نے وفات پائی، دادا کے بعد والد شیخ محمد شاہ کی گرویدگی اپنے بیٹے سے بہت بڑھ گئی اور تربیت و پرورش جو ابھی تک دادا محترم انجام دے رہے تھے، وہ شیخ محمد شاہ نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ شیخ ابوالغوث چوں کہ ابتدا ہی سے کمزور اور جسمانی عوارض میں گھرے ہوئے تھے، اس لیے بھی قدرتاً شیخ محمد شاہ کی توجہ ان کی طرف بہت زیادہ بڑھ گئی۔ سعادت و نیک بختی ان کے ہم رکاب تھی، اس لیے ان کی سعادت مندی اور حسنِ صفات کو شیخ محمد شاہ دیکھتے تو بے حد مسرور ہوتے اور خدا کا شکر بجالاتے۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان جب حرف شناسی اور مکتب جانے کی عمر کو پہنچے تو انتہائی خاموشی کے ساتھ ان کی بسم اللہ کرادی گئی۔ اس زمانے میں بچوں کی بسم اللہ کے تعلق سے جو رسمیں رائج تھیں، ان میں سے کوئی بھی انجام نہیں دی گئیں۔ بلکہ ولادت کے بعد نومولود کے سلسلے میں جن رسموں کا اس زمانے میں رواج تھا، ان سے بھی احتراز برتا گیا۔ مثلاً ایک رسم نمک چشی کی ہوتی تھی، بچہ جب کچھ بڑا ہوتا تو اس کا ختنہ کیا جاتا، مکتب جانے کی عمر ہوتی تو اس کی بسم اللہ کرائی جاتی، اور ان ساری رسموں میں گھر، خاندان، آس پڑوس اور محلے گاؤں کے لوگ اکٹھا ہوتے، بچے کو مبارک بادیاں پیش کی جاتیں، دعوتیں ہوتیں اور بھی طرح طرح کی خرافات ہوتیں۔ مگر اللہ نے شیخ ابوالغوث کی ان خرافات سے حفاظت فرمائی اور کم عمری کے باوجود شریعت کے ناپسندیدہ امور سے وہ بچے رہے۔

مکتب کی تعلیم کے ساتھ والد کی تربیت بھی جاری رہی، والد کی توجہ زیادہ اس پر مرکوز رہی کہ خاندانی وراثت یعنی تصوف واحسان ان کے رگ وریشے میں پیوست ہوجائے اور بڑے ہوکر مسند ارشاد وسلوک سنبھال لیں۔ لہٰذا اسی لحاظ سے وہ ان کی تربیت بھی کرتے تھے۔ شیخ ابوالغوث گرم دیوان کا بیان ہے کہ 'ایک مرتبہ میں والدہ کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ماحضر تناول کررہا تھا کہ اسی درمیان ایک بوڑھا ضعیف گھر کے دروازے پر آکر بیٹھ گیا۔ میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوسکا اور کھانے میں مشغول رہا۔ اتنے میں والد بزرگوار اچانک گھر میں داخل ہوئے اور مجھے دسترخوان پر بیٹھا دیکھ کر سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا 'مہمان دروازے پر بیٹھا ہے اور تم لوگ یہاں بیٹھے کھانا کھارہے ہو! کتنا اچھا ہوتا کہ اگر یہی کھانا راہِ سلوک کی میزبانی پر عمل کرتے ہوئے مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔' شیخ ابوالغوث کہتے ہیں کہ 'میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے بعد اس کا اہتمام کیا کہ مجھے کھانے پینے کی جو بھی نعمت اللہ کی طرف سے حاصل ہوئی، اس میں مدرسہ کے طلبہ یا خانقاہ کے فقرا کو ضرور شامل کیا۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان عمر کے دسویں سال میں تھے، مکتبی تعلیم کے ساتھ خانقاہی تربیت بھی چل رہی تھی، والد بزرگوار اخلاق وکردار کی خصوصی نگہداشت کررہے تھے، اس کا اثر یہ ہوا کہ کم عمری ہی میں عبادت کے ذوق سے آشنا ہوگئے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی ایسی تھی کہ بڑوں کو رشک آئے، مکمل احتیاط اور کامل ادب کے ساتھ عبادات کی ادائیگی کرتے، نوافل ووظائف کا بھی ایک حد تک اہتمام اسی عمر میں ہوچلا تھا۔ غرض بچپن ہی سے ان کی بلندی کا ستارہ ان کے سر پر چمک رہا تھا اور اوج وکمال کی علامتوں سے ان کی پیشانی مزین تھی۔

والد ماجد شیخ محمد شاہ اپنے بیٹے کی اٹھان سے بہت خوش تھے اور انھیں دل سے قریب رکھتے تھے۔ گذر چکا ہے کہ شیخ محمد شاہ نے اخیر عمر میں دنیا سے بالکل قطعِ تعلق کرلیا تھا اور طریقۂ سلوک وتجرد پر گامزن ہوگئے تھے۔ بزرگوں کی زیارت اور اہل اللہ کے مزارات سے کسبِ فیض کے لیے انھوں نے اسفار بھی کیے۔ انھی اسفار میں کسی بزرگ سے انھیں ایک متبرک تعویذ ملا تھا جسے وہ اپنے گلے میں پہنے رہتے تھے۔ شیخ ابوالغوث کا بیان ہے کہ 'جب میری عمر گیارہ سال ہوئی اور والد محترم کی صحت گرنے لگی تو مجھے شدید خواہش ہوئی کہ وہ متبرک تعویذ والد ماجد مجھے عطا

فرمادیں، مگر ان کی ہیبت اور ادب کی وجہ سے اس خواہش کا اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک دن والد ماجد نے مجھے بلایا، اپنی آغوشِ محبت میں بٹھایا، چند نصیحتیں کیں اور پھر وہ تعویذ نکال کر مجھے عنایت فرمایا، وہ تعویذ گویا کہ شیخ ابوالغوث کے لیے والد ماجد کی طرف سے راہِ تجرد وسلوک میں قدم زن ہونے کا اجازت نامہ تھا۔

دوسال کے بعد جب شیخ ابوالغوث عمر کے تیرہویں مرحلے میں داخل ہوئے تو والد محترم کی صحت نے بالکل جواب دے دیا۔ شیخ ابوالغوث کو بار بار یہ خیال آتا کہ والد ماجد جلد ہی رحلت فرمانے والے ہیں، ان کے دنیا سے منھ موڑنے سے پہلے ان کے ہاتھوں پر بیعت ہو جانا چاہیے اور ظاہری و باطنی فوائد حاصل کر لینے چاہیے۔ شیخ ابوالغوث کا بیان ہے کہ بیعت ہونے کا خیال شدت سے دل میں آتا، مگر مشکل یہ تھی کہ والد بزرگوار کی اتنی ہیبت میرے دل میں تھی کہ کبھی میں ان کی خدمت میں سر اٹھا کر حاضر نہیں ہوا اور نہ کبھی ان سے کوئی بات کہنے کی ہمت کر سکا، جو بھی ضرورت ہوتی، دوسروں کے واسطے سے ان کی خدمت میں پہنچا تا تھا۔ یہاں بھی یہی صورت نظر آئی اور ہمت کر کے ایک واسطے کے ذریعے بیعت کی درخواست والد بزرگوار کی خدمت میں بھجوائی۔ پہلے تو انھوں نے توقف کیا، پھر مراقبہ کیا تو منکشف ہوا کہ بیٹے کی مقصد برآری دوسری جگہ سے مقدر ہے، مگر اجرائے سلاسل کے لیے اسے بیعت کر لینے میں حرج نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۱- ربیع الثانی ۱۱۱۳ھ [۱۳ نومبر ۱۷۰۱ء] کو بلا کر بیعت سے مشرف فرمایا۔

بیعت کے دس مہینے بعد ۱۵- صفر ۱۱۱۴ھ کو شیخ محمد شاہ نے اس دنیا کو الوداع کہا۔

والد ماجد کی وفات کے بعد شیخ ابوالغوث کے دل کی کیفیت دگرگوں ہو گئی، ثابت قدمی و استقلال کے ساتھ وہ خدا کے اس فیصلے پر راضی تو رہے، مگر حادثے کا اثر یہ ہوا کہ دل دنیاوی امور سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ بار بار خیال آتا کہ لباس تبدیل کر کے مسافرت یا عزلت نشینی اختیار کر لیں، مگر دوسری طرف مسئلہ یہ تھا کہ اہل خاندان کو سنبھالا دینا تھا، متعلقین و محبین کس مپرسی کی حالت میں تھے، انھیں بھی حوصلہ دینا تھا۔ اگر عزلت نشیں ہو جاتے تو یہ سارے افراد ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتے۔ بالآخر بڑی کش مکش کے بعد اس خیال کو دل سے کھرچ کر نکالا اور لوگوں کو سنبھالنے اور تسلی و دلاسہ دینے میں لگ گئے اور اپنی تسلی کا انتظام یہ کیا کہ جب موقع ملتا تو دادا محترم

کی قبر پر جا کر مراقب ہو جاتے اور وہاں تسلی کا سامان پا لیتے۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے اساتذہ میں صرف ایک نام میر سید غلام احمد محمد آبادی کا ملتا ہے جس کا ذکر شیخ شمس الدین حیدری نے اپنی کتاب مناقبِ غوثی میں کیا۔ ان سے کیا پڑھا اور کہاں پڑھا، اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میر سید غلام احمد حضرت شاہ موسیٰ عاشقان اودھی کی اولاد میں سے ہیں اور بڑے کامل اور ماہر استاذ تھے۔ دکانِ معرفت کی تلاش میں شیخ ابوالغوث نے جب الہ آباد کا سفر کیا تھا، تو وہاں ان کی استاذ محترم سے ملاقات ہوئی تھی۔ الہ آباد آنے کی غرض معلوم ہوئی تو انھوں نے حصولِ مقصد کے لیے حضرت سید شاہ فتح محمد [۱] کی طرف رہنمائی بھی کی تھی، جن سے شیخ ابوالغوث گرم دیوان نے بیعت کی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی ان شاءاللہ۔

حاشیہ

۱- شیخ فتح محمد سیدانوی کے اجداد سبزوار سے آ کر سیدانہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ سیدانہ الہ آباد سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ شیخ فتح محمد کی ولادت سیدانہ میں ہوئی۔ حصول علم کے دوران اورنگ زیب عالم گیر کی فوج میں شامل ہو گئے، پھر سلوک و معرفت کی طرف رجحان بڑھا تو شیخ ابراہیم بن شیخ عبدالحق حسینی مانک پوری سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کر لیا اور دنیا و اسباب دنیا سے قطع تعلق کر لیا۔ الہ آباد میں دکان معرفت سجائی اور مسترشدین و متوسلین کی رہنمائی کرتے رہے۔ بلند مرتبہ عالم تھے، مختلف علوم وفنون میں کئی کتابیں لکھیں۔ تفسیر قرآن میں ''تفسیر محمدی''، تصوف کے حقائق و معارف میں ''مجمع الانوار'' اور ''مجمع الاسرار'' ان کی یادگار ہیں۔ چہارشنبہ ۱۵ رجب ۱۱۴۳ھ [۲۴ جنوری ۱۷۳۱ء] میں سیدانہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ [شیخ وجیہ الدین اشرف، بحر زخار، مرکز تحقیقات فارسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، جلد اول، ص ۵۶۷، ۵۶۸]

• • •

بیعت وخلافت

والد کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک تو دل جمعی کے ساتھ اپنے اجداد کے آستانے سے چمٹے رہے، مگر جب حصولِ علم ومعرفت کا خیال دل میں شدت کے ساتھ اٹھنے لگا تو قدم بے خودانہ سفر کے لیے آمادہ ہونے لگے۔ والد ماجد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حصولِ معرفت وعلم کے لیے پہلے احمد آباد اور بنارس کا رخ کیا۔ وہاں کے مدارس وخانقاہ کے چکر لگائے، اکابر واعیان سے ملاقاتیں کیں، اہل علم کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور اہل اللہ کے سامنے مودب بیٹھے، مگر مطلوب کے حصول کی جیسی خواہش تھی، وہ پوری نہیں ہوئی۔ لیکن ان صحبتوں سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ حصولِ علم ومعرفت کا جذبۂ شوق دوگنا ہوگیا۔

بنارس سے نکلے تو غازی پور پہنچے اور یہاں کے اہل علم اور اہل اللہ کی صحبت میں بھی چند دن گزارے، اس کے بعد وطن واپس لوٹ آئے۔ وطن واپسی کے بعد ہر طرف سے یک سو ہوکر خود کو اجداد کے آستانہ کے کاموں میں مصروف کرلیا۔

روح آباد/ کچھوچھہ کا پہلا سفر

حصولِ معرفت کی چنگاری جو دل میں سلگ رہی تھی، وہ رفتہ رفتہ شعلہ بن گئی اور اس نے سید اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ کے مرقد مبارک کی زیارت کا شوق پیدا کردیا، مگر آستانے کی دیگر مصروفیات کی وجہ سے اور کسی مناسب تقریب کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت دنوں تک یہ شوق شوق ہی رہا، روبہ عمل نہ ہوسکا۔ پھر ایک تقریب یہ پیدا ہوئی کہ شیخ ابوالغوث کی زبان کے دونوں کنارے سیاہ پڑ گئے، دوستوں اور بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ یہ ایک بیماری ہے جس کے علاج

کے لیے سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے مزار پر حاضری دینی چاہیے۔ شیخ ابوالغوث تو پہلے سے تیار بیٹھے تھے، بس کسی تقریب کا انتظار تھا۔ فوراً سامانِ سفر تیار کیا، آستانے کی دیکھ بھال عزیزوں کے حوالے کی اور سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے مرقد مبارک کی زیارت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے آستانے پر چالیس دن قیام کیا اور وہاں کے انوار و برکات سے شاد کام ہوئے۔ واپس ہونے لگے تو ہدایت ملی کہ حضرت مولانا شاہ رمضان قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے وطن جانا۔ تعمیل حکم میں ان کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان کے الطاف و فیوض سے ہم کنار ہوئے۔

سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے مزار کی زیارت کا یہ اثر ہوا کہ شیخ ابوالغوث کی طبیعت مکمل طور پر اہل اللہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ واپس آنے کے بعد وطن کے اطراف میں جہاں انھیں کسی اللہ والے کی خبر ملتی تو ان کی زیارت و ملاقات کے لیے حاضر ہوتے اور ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے کی کوشش کرتے۔ ساتھ ہی اجداد کے آستانے کی نگہ داشت کرتے، متعلقین و محبین اور مسترشدین کی رہنمائی بھی کرتے اور خاندانی جاگیر کا انتظام بھی سنبھالتے۔

تلاشِ مرشد کے لیے الہ آباد کا سفر

اسی کیفیت پر ایک مدت گزرنے کے بعد جب قلب کی شورش بڑھی، حصول معرفت کی لگن تیز سے تیز تر ہوئی تو دوبارہ وطن سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ اس مرتبہ مسافرت اختیار کی تو سیدھے الہ آباد پہنچے۔ اس وقت الہ آباد اہل اللہ کا مسکن اور سالکین کا مرجع تھا، دکانِ معرفت کی کوئی کمی نہیں تھی، راہ سلوک کے آزمودہ مشائخ الہ آباد میں موجود تھے۔ شیخ ابوالغوث نے کئی بزرگوں کی خدمت میں حاضری دی مگر طبیعت کا اطمینان حاصل نہیں ہوا۔

اسی دوران شیخ ابوالغوث کی ملاقات اپنے استاذ محترم میر سید غلام احمد سے ہوئی، وہ بھی اس وقت الہ آباد میں فروکش تھے۔ انھوں نے سفر کا سبب دریافت کیا تو شیخ ابوالغوث اپنا مقصدِ سفر ان کے سامنے رکھا۔ عرض کیا کہ یہ محض ایک غیر اختیاری سفر ہے جو تلاشِ مرشد کے لیے ہوا ہے، ورنہ الحمدللہ گوشہ اور توشہ دونوں کی آسایش مجھے حاصل ہے۔ انسان انھیں دو چیزوں کی تلاش میں

سفر کی صعوبت برداشت کرتا ہے۔ اجداد بزرگوار کی طرف سے جو کام مجھے تفویض ہوا ہے، مجھے محسوس ہورہا ہے کہ اس میں پیچیدگی بہت ہے، اس لیے دل میں بےساختہ مرشد و رہبر کامل کی جستجو پیدا ہوئی ہے، تا کہ اس کی ہدایت و رہنمائی میں میں بہ حسن وخوبی اجداد کے تفویض کردہ امور کو انجام دے سکوں۔

استاذ محترم نے جب ان کی لگن، تڑپ اور خلوص وللّٰہیت کو جان لیا تو فرمایا کہ 'اس شہر میں میں نے ایک درویش کو دیکھا ہے، جو طالبانِ حق کی تربیت و اصلاح کی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں، ان کی خدمت وصحبت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ شاید ان کے یہاں پہنچ کر آپ کی جستجو پوری ہوجائے اور مقصود حاصل ہوجائے۔'

وہ بزرگ جن کی طرف استاذ محترم نے رہنمائی کی تھی، وہ حضرت سید فتح محمد سیدانوی تھے۔ استاذ کی رہنمائی پر عمل کرتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ملاقات کی اور ان کی صحبت میں بیٹھے تو دل کی کلی کھل اٹھی، برسوں کی بےقراری کو قرار آ گیا، دل مطمئن ہوا، طبیعت سیر ہوئی اور کامل شرحِ صدر حاصل ہوگیا۔ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا، ان کے آستانے کی دھول کو سرمۂ بصیرت و معرفت سمجھ کر آنکھوں پر ملا۔

مرشد کی خدمت میں

شیخ ابوالغوث اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ 'حضرت قدس سرہ کے کمالاتِ عالیہ کو جب میں نے استاذ محترم سے سنا تو مجھ پر ایک خوف سا طاری ہوگیا اور بےخودی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جب میں حضرت کے روبرو پہنچا اور چہرے پر نگاہ پڑی تو سینے میں ایک بےداری کی لہر دوڑ گئی۔ حضرت مجھے دیکھ کر ازرہِ کرم کھڑے ہوگئے اور چند قدم آگے بڑھ کر استقبال کیا اور کمالِ ذرہ نوازی سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی مسند تک لے گئے، اپنے برابر میں بٹھایا اور آنے کا مقصد دریافت کیا۔ عرضِ مدعا کے بعد حصولِ مدعا کی بشارت سنائی اور سلسلۂ چشتیہ میں بیعت سے سرفراز فرمایا۔'

بیعت کے بعد ایک رات کا واقعہ ہے کہ مجلس خاص لگی ہوئی تھی، حاضرینِ مجلس ہمہ تن

گوش تھے، ان کا ذوق وشوق پورے عروج پر تھا، حضرت کی زبانِ مبارک سے معانی و نکات، حقائق ودقائق اور اسرار وعرفان کے پھول جھڑ رہے تھے کہ اچانک شیخ ابوالغوث کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ 'حق تعالی نے تمھیں فیوضِ احمدی سے نوازا ہے۔' مرشد کی زبان سے یہ کلمات شیخ ابوالغوث کے لیے ایک طرح سے سند تھے اور اس سے ان کی صالحیت وصلاحیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس درجہ کے جوہر قابل تھے اور کس تیزی سے انھوں نے مراتبِ سلوک طے کیے تھے۔

آستانۂ مرشد پر چند دن قیام کے بعد جب لوٹنے لگے تو حضرت سید فتح محمد نے انھیں خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور خواجگانِ چشت کی امانتوں کا امین بنایا۔ وطن بھیرا پہنچے تو پوری تن دہی اور سرگرمی کے ساتھ طریقۂ ارشاد وسلوک میں مشغول ہو گئے اور یادِ خدا اور سالکین کی رہنمائی میں ہمہ تن ڈوب گئے۔

آستانۂ مرشد سے واپسی کے بعد

الہ آباد کے سفر سے پہلے آبا واجداد کی جاگیر کی نگرانی اور اس کا انتظام وانصرام خود شیخ ابوالغوث گرم دیوان دیکھا کرتے تھے، مگر مرشد کی خدمت سے لوٹنے کے بعد خود کو سارے دنیاوی جھمیلوں سے یک سو کر لیا۔ ایک دن خانگی امور کی نگہ داشت کرنے والے وکیلوں نے درخواست کی کہ حضرت نے خود کو سارے مقدمات ومعاملات سے علاحدہ کر لیا ہے، اگر اجازت ہو تو کبھی کبھی بہ وقت فرصت آمد وخرچ کے کاغذات آپ کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں، تا کہ آپ حساب دیکھ لیا کریں۔ یہ سن کر ایک سرد آہ کھینچی اور فرمایا کہ 'یہ فقیر خود حساب میں پھنسا ہوا ہے، دوسروں سے کیا حساب لے گا۔ سانس کی آمد ورفت بے فائدہ خرچ ہو رہی ہے، قلب اخلاص سے خالی ہے، شیطان دماغ پر مستولی ہے، حواسِ خمسہ بے قابو ہیں، توکل وقناعت کی پونجی سے گرہ نا آشنا ہے، ہمت واستقلال کا حال یہ ہے کہ عزائم وجود میں آنے سے پہلے معدوم ہو جاتے ہیں۔ جب میری جان خود اتنی پیچیدگیوں میں پھنسی ہے تو پھر میں تم لوگوں سے حساب لینے یا کاغذات دیکھنے کا وقت کہاں سے نکالوں۔'

مزید اجازتیں

حضرت سید فتح محمد کے علاوہ شیخ ابوالغوث گرم دیوان کو تین اور بزرگوں سے خلافت عطا ہوئی تھی۔ ایک حضرت راجی سید خیراللہ محمد آبادی[۱] سے، دوسرے حضرت راجی دانی جون پوری [۲] سے اور تیسرے حضرت شاہ ظہور محمد[۳] سے۔ یہ تینوں خلافتیں بھی سلسلۂ چشتیہ میں عطا ہوئی تھیں۔ اس کی تفصیل لہرا میں قیام کے باب میں آئے گی ان شاء اللہ۔

حواشی

۱- اصل نام سید غلام نظام الدین ہے، راجی خیراللہ عرفیت ہے۔ محمد آباد و اطراف کے صاحبِ ولایت تھے، اس لیے اکثر محمد آباد میں قیام رہتا تھا۔ محمد آباد سے پچھّم مسلمانوں کی معروف آبادی خیرآباد کا نام انھیں کے نام پر خیرآباد پڑا۔ محمد آباد میں پنج شنبہ ۷ رجب ۱۱۲۸ھ [۲۷ جون ۱۷۱۶ء] میں انتقال ہوا اور گھر کے صحن میں دفن کیے گئے۔ ان کے بعد مسند طریقت پر ان کے فرزند رشید راجی سید مردان علی جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت راجی خیراللہ کا تفصیلی ذکر قیام وحدت آباد لہرا کے باب میں آئے گا۔

۲- اصل نام سید غلام معین الدین ہے، راجی دانی عرفیت ہے۔ یہ راجی سید خیراللہ کے بڑے بھائی تھے۔ جون پور کے صاحب ولایت تھے، اس لیے جون پور میں مستقل قیام تھا۔ اپنے والد سید غلام محی الدین سے خلافت حاصل کی تھی اور ساتھ ہی میں سید ابراہیم کے بھی مرید و خلیفہ تھے۔ شعبان ۱۱۳۰ھ [جولائی ۱۷۱۸ء] میں جون پور میں وفات پائی اور اپنی خانقاہ میں دفن کیے گئے۔ ان کے بعد ان کے خلف رشید راجی سید غلام احمد آستانہ کے مجاور مقرر ہوئے۔ شیخ ابوالغوث سے تعلق و اجازت کا ذکر قیام وحدت آباد لہرا کے باب میں آئے گا۔

۳- حضرت شاہ ظہور محمد شیخ ابوالغوث کے پیر و مرشد حضرت سید فتح محمد سیدانوی کے صاحب زادے ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے جانشین بنے اور تمام صوری و معنوی حقوق کے ساتھ مسند طریقت کو آراستہ رکھا۔

◆ ◆ ◆

نکاح، اہلیہ اور اولاد

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی نسبت ان کے والد بزرگوار نے اپنی زندگی ہی میں قصبہ سپاہ میں شیخ منور خان صدیقی بن شیخ میر خان کی دختر سے طے کر دی تھی۔ شیخ منور خان شیخ ابوالغوث کے ماموں تھے۔ شیخ منور خان کے بیٹے شیخ عبداللہ خان نے نکاح کی عمر ہونے کے بعد جلد از جلد نکاح کی کوشش کی، مگر شیخ ابوالغوث اور ان کی والدہ کی خواہش تھی کہ نکاح میں ابھی اور ذرا تاخیر ہو تو مناسب ہے۔ لوگوں نے شیخ ابوالغوث کو نکاح کے لیے تیار کرنے کی غرض سے حضرت راجی سید خیر اللہ محمد آبادی کو درمیان میں ڈالا۔ حضرت راجی نے جب بات کی تو ان کے مشورے کو حکم سمجھتے ہوئے فوراً نکاح کے لیے راضی ہو گئے۔ یہ نوید مسرت جب طرفین کو ملی تو سارے لوگ بے حد خوش ہوئے اور ۱۱۲۳ھ [۱۷۱۱ء] کی کوئی تاریخ نکاح کے لیے طے ہوئی۔

شیخ ابوالغوث کے بھائی شیخ احمد [جو ان کے انتہائی محبوب بھائی تھے] اور لڑکی کے بھائی شیخ عبداللہ کا ارادہ تھا کہ نکاح انتہائی تجمل و ترفہ کے ساتھ کیا جائے گا، مگر جب شیخ ابوالغوث کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے کسی بھی طرح کے اظہارِ ترفہ سے صاف منع کر دیا اور سارے رسم و رواج اور خلافِ سنت امور کے روبہ عمل لانے سے سختی سے روک دیا۔

نکاح کے دن اپنے استاذ محترم میر سید غلام احمد کی قیادت میں اپنے چند اعزا اور متوسلین کے ساتھ بغیر کسی اعلان و اظہار کے سپاہ کا قصد کیا۔ اپنے دونوں بھائی شیخ احمد شاہ اور شیخ محمد واجد کو بھی اپنے ساتھ نہیں لیا۔ عصر کے وقت سپاہ کے قریب پہنچے تو قافلے والوں نے کہا کہ اب تھوڑی دور پر قصبہ سپاہ ہے، ذرا رک کر سانس اور لباس وغیرہ درست کر لیتے اور اپنی آمد کی اطلاع میزبانوں کے پاس بھجوا دیتے ہیں، تاکہ وہ تیار ہو جائیں۔ شیخ ابوالغوث نے فرمایا کہ جب رسم دنیا

کی اب تک رعایت نہیں کی گئی ہے تو اب کیوں ان تکلفات میں پڑا جائے، اسی حالت میں چلتے ہیں اور وہیں پہنچ کر آرام کیا جائے گا۔ چنانچہ قافلہ آگے بڑھا اور سپاہ پہنچ کر خانقاہ میں جہاں مہمانوں کا نظم تھا، فروکش ہوا۔

خانقاہ میں سارے مہمانوں کے لیے عمدہ بستر لگے ہوئے تھے۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا، جماعت کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی گئی۔ نماز کے بعد شیخ ابوالغوث اپنا چہرہ جنوب کی طرف کر کے بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہاں کی رسم ہے کہ دولھا قبلہ کی طرف چہرہ کر کے بیٹھتا ہے۔ اسی کی مخالفت میں انھوں نے جنوب کا رخ کیا تھا۔ میز بانوں نے خلافِ رسم عمل دیکھا تو بہت جز بز ہوئے، مگر کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکے۔ استاذ محترم میر سید غلام احمد معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے اور انھوں نے شیخ ابوالغوث سے کہا کہ خیر المجالس مستقبل به القبلة یعنی بہترین بیٹھنا قبلہ کا رخ کر کے بیٹھنا ہے۔ استاذ کی بات سنی تو فوراً قبلہ رو ہو گئے اور میز بانوں کی جان میں جان آئی۔

تھوڑی دیر کے بعد پکار آئی کہ دسترخوان لگ گیا ہے، چل کر کچھ کھا پی لیں۔ سارے لوگ دسترخوان پر حاضر ہوئے اور قند و گلاب اور ٹھنڈے مشروبات کا لطف لینے لگے۔ میز بانوں نے جب یہ چیزیں شیخ ابوالغوث کے سامنے پیش کیں تو انھوں نے معذرت کی اور بتلایا کہ وہ روزے سے ہیں۔ ابھی دسترخوان ہی پر تھے کہ مغرب کا وقت آن پہنچا، روزہ افطار کیا اور جماعت کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی۔

نماز کے بعد دیگر رفقائے سفر نے تو بستر استراحت کا رخ کیا، مگر شیخ ابوالغوث وہیں مسجد کے ایک گوشے میں یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ رات کا ایک تہائی حصہ گزر گیا تو مجلس نکاح آراستہ ہوئی۔ نکاح کے بعد قسم قسم کے کھانوں سے سجا ہوا دسترخوان لگایا گیا۔ شیخ ابوالغوث چوں کہ مرغن و ملون کھانوں اور شکم پری سے احتیاط کرتے تھے، اس لیے تھوڑا سا کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد رفقائے سفر نے بستروں کا رخ کیا اور شیخ ابوالغوث نے اپنا معمول پورا کرنے کے لیے مصلیٰ بچھا لیا۔ معمول سے فراغت کے بعد رسم کے مطابق منقش و رنگین بستر اور مزعفر تکیہ آرام کے لیے بچھایا گیا۔ اس تجمل کو دیکھ کر شیخ کی طبیعت بگڑ گئی اور اس پر لیٹنے سے انکار کر دیا، بلکہ مزید یہ کیا کہ سسرال کی طرف سے جو کپڑا پہنایا گیا تھا، اسے بھی نکال کر سسرال

والوں کے حوالے کر دیا۔ جب یہ خبر قصبے میں پھیلی تو پورے قصبے میں ہل چل مچ گئی۔

چند گھنٹوں کے بعد صبح صادق ہوئی، شیخ ابوالغوث نے میزبانوں کے ہاں کہلوا بھیجا کہ ان دنوں میں سورج میں تپش اور حرارت بہت ہوتی ہے، رخصتی کی تیاری کر لیں، سورج نکلنے سے پہلے ان شاء اللہ ہم لوگ یہاں سے نکل جائیں گے۔ مگر شادی بیاہ میں عام طور سے ایسے مواقع پر تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد شیخ ابوالغوث نے جب دیکھا کہ رخصتی میں ابھی کافی وقت لگے گا تو قصبہ کے ایک بیمار بزرگ [جن سے ان کی پرانی یاد اللہ تھی] کی عیادت کے لیے چلے گئے۔ وہاں سے لوٹے تو رخصتی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ فوراً میزبانوں سے اجازت لی اور گھر کے لیے رختِ سفر باندھا۔

ابھی کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ پیچھے سے کچھ لوگ عروسی سامان لے کر آ گئے، شیخ ابوالغوث کو عروسی سامان کا ساتھ کرنا بہت ناگوار گزرا، مگر مصلحتاً اور اہلیہ کی تالیفِ قلب کے لیے خاموش رہے۔ گھر پہنچے تو اہلیہ کو محل میں والدہ کے پاس بھیج دیا اور خود جنوب کے باغ میں والد بزرگوار کی قبر کے پاس جہاں انھوں نے عبادت و ریاضت کے لیے اپنا الگ حجرہ بنایا تھا، اس میں چلے گئے۔ محل میں لوگوں کا ہجوم جب ختم ہوا تو آپ حجلہ عروسی میں پہنچے اور جو زیور اور عروسی سامان وغیرہ اہلیہ لے کر آئی تھیں، سب کو علاحدہ کیا اور غربا و فقرا میں تقسیم کر دیا۔

اہلیہ محترمہ

شادی سے پہلے شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی اہلیہ محترمہ نے ایک مبارک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر شیخ ابوالغوث سے عقدِ نکاح کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ خواب یہ دیکھا تھا کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا اہل اللہ کی ایک جماعت کے ساتھ قصبہ سپاہ میں نکاح کی غرض سے تشریف لائے ہیں۔ ان کی آمد کی خوش خبری ہر گلی کوچے میں پہنچ گئی ہے اور لوگ حصولِ فیض کے لیے کشاں کشاں ان کے پاس چلے آ رہے ہیں۔ جب شیخ ابوالغوث سے عقدِ نکاح کی تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے تعبیر نکالی کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا سے مراد یہی ولیِ وقت ہے جس سے میرے نکاح کی بات چل رہی ہے اور اہل اللہ کی جماعت سے یہ تعبیر لی کہ اللہ

والے اس ولی کی رفاقت میرے حق میں چاہتے ہیں۔

شیخ ابوالغوث کی اہلیہ محترمہ کا نام فاطمہ تھا، انتہائی پاک باز، راست باز، صالحہ، پارسا اور اطاعت شعار خاتون تھیں۔ شوہر کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتیں، شوہر کے حکم سے کبھی سرمو انحراف نہیں کیا۔ ان کی یہ اطاعت شعاری اور فرماں برداری ایسا نہیں ہے کہ شیخ کے نکاح اور صحبت میں آنے کے بعد پیدا ہوئی تھی، بلکہ یہ فطری و وہبی تھی۔ نکاح کے بعد جب وہ شیخ کے گھر میں اتریں تو پھر انھیں کے رنگ میں رنگ گئیں۔ ابھی گذرا ہے کہ شیخ نے سارے سامانِ عروسی کو فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیا تھا۔ اہلیہ نے اس تقسیم کو صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ بہ دل و جان اس پر راضی بھی تھیں۔

شادی کے ایک دو روز کے بعد شیخ نے ایک سفید جوڑا گھر میں بھجوایا اور کہلوایا کہ 'عروسی لباس اتار کر اسے زیب تن کر لیں۔ طریقۂ درویشی میں رنگینی پر بے رنگی کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ یہاں صرف ایک رنگ ہوتا ہے اور وہ ہے اللہ کا رنگ۔' جب یہ سفید جوڑا گھر میں پہنچا تو ہل چل مچ گئی، عورتیں بہت جزبز ہوئیں، کوئی عورت کسی صورت اس جوڑے کو پہنانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ عورتوں کا کہنا تھا کہ شادی کے ایام ابھی چل رہے ہیں، اس میں عروسی لباس نکال کر سفید کپڑا پہنانا کسی صورت مناسب نہیں ہے۔ عین شادی اور مبارک بادی کے درمیان گھر میں عجیب سی کشا کش پیدا ہوگئی۔ اہلیہ محترمہ نے جب یہ کشا کش دیکھی تو مجبوراً دخل دیا اور اعتراض کرنے والی عورتوں سے کہا کہ 'اس ہدیے کو قبول یا رد کرنے کا اختیار آپ لوگوں کو نہیں ہے، یہ میرے لیے بھیجا گیا ہے اور میں اسے قبول کرتی ہوں۔' یہ کہہ کر اس جوڑے کو اٹھایا اور بہ حفاظت تمام لے جا کر کمرے میں رکھ دیا۔ رات میں شیخ جب کمرے میں پہنچے تو پورا ماجرا بیان کیا اور عرض کیا کہ 'اس خادمہ نے مصلحت اور رسموں کی پرواہ کیے بغیر اس ہدیے کو قبول کیا، مگر اسے پہننے میں اس لیے تامل ہوا کہ یہ مجھے دوسروں کے ہاتھوں سے ملا تھا۔ مقام یک رنگی میں دوسرے کا کیا کام؟ اب جب آپ خود تشریف لائے ہیں تو میری خواہش ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مجھے پہنا دیجیے۔' شیخ ابوالغوث اطاعت کے اس جذبے سے بے حد خوش ہوئے اور ان کی خواہش کی تکمیل کی۔

بچی اور بچے کی ولادت

نکاح کے ایک سال کے بعد یعنی ۱۱۲۴ھ [۱۷۱۲ء] میں اللہ نے ایک بچی سے نوازا اور دوسرے سال [ربیع الثانی ۱۱۲۵ھ/مئی ۱۷۱۳ء] بچے کی ولادت ہوئی۔ بچے کا نام علی اکبر رکھا گیا۔ بچی بڑی ہو کر شیخ ابوالغوث کے ہم شیر زادہ شیخ عبدالحکیم خان صدیقی سے منسوب ہوئی اور صاحبِ اولاد ہوئی۔ بچے کی ولادت کے موقع پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ پسر نومولود کی خبر سن کر کسی خادم نے جا کر مبارک باد دے دی۔ یہ اس زمانے کے رواج کے عین مطابق تھا، مگر شیخ ابوالغوث کو چوں کہ رواج و رسومات سے سخت تنفر تھا، اس لیے مبارک باد پر ان کی طبیعت سخت مکدر ہوئی اور یہ تکدر کئی روز تک باقی رہا۔

اہلیہ کی وفات

بچے کی ولادت کے چند دنوں کے بعد اہلیہ محترمہ کی وفات ہوگئی۔ وفات کی تاریخ ۱۹ ربیع الثانی ۱۱۲۵ھ [۱۵ مئی ۱۷۱۳ء] ہے۔ وفات کے دن شیخ ابوالغوث بھیرا میں موجود نہیں تھے، اپنے برادرِ نسبتی شیخ عبداللہ کی دعوت پر قصبہ سیاہ گئے ہوئے تھے۔ جس وقت اہلیہ کی طبیعت بگڑی اور موت کا وقت قریب آیا، عین اسی وقت شیخ ابوالغوث اچانک میزبان سے اجازت لے کر بھیرا کے لیے روانہ ہو گئے۔ شیخ عبداللہ نے اس اچانک جانے پر تعجب کا اظہار کیا اور بہت روکنے کی کوشش کی، مگر وہ رکے نہیں۔ مشہور ہے:

دل را بہ دل رہے است دریں گنبد سپہر

عین جنازہ و تدفین کے وقت بھیرا پہنچ گئے، جنازہ و تدفین میں شریک ہوئے اور اپنے اجداد کی قبرستان میں انھیں دفن کیا۔

بچے کی وفات

اہلیہ کی وفات کے چند دنوں کے بعد نومولود صاحب زادے علی اکبر نے بھی داغِ

مفارقت دی۔

والدہ کی وفات

اہلیہ اور بچے کی وفات کے ٹھیک ایک سال بعد شیخ ابوالغوث کی والدہ ماجدہ نے بھی ۲۱ ربیع الثانی ۱۱۲۶ھ [۶ مئی ۱۷۱۴ء] کو دنیا سے منھ موڑا۔

ان پیہم حادثوں نے شیخ ابوالغوث کو سخت مضطرب کر دیا اور قلب پر کاری زخم لگائے۔ دل آبادی و وطن سے اچاٹ ہو گیا اور شدت کے ساتھ خیال پیدا ہونے لگا کہ اب یادِ الٰہی کے لیے یک سو ہو جانا چاہیے اور کسی ویرانے کی راہ لینی چاہیے۔

سلطان پور بھیرا سے وحدت آباد لہرا

شیخ ابوالغوث گرم دیوان نے ان حادثوں کے بعد خود کو یادِ حق کے لیے فارغ کرلیا اور ایک ویرانے یعنی وحدت آباد لہرا کی راہ لی۔ اعظم گڑھ سے مئو جانے والی شاہ راہ پر جنگل واقع تھا، جنگل کے جنوب میں اُس وقت وحدت آباد لہرا کی آبادی تھی۔ شیخ کے اجداد کو ابراہیم شاہ شرقی کی طرف سے جو قریات ومواضعات گزراوقات کے لیے بہ طور جاگیر ملے تھے، ان میں ایک موضع یہ بھی تھا۔ لہرا عجیب فرحت ناک جگہ تھی، جنگل کی فضا انتہائی روح افزا اور راحت رسا تھی۔ اسی وجہ سے برسوں وہ جنگل اصحابِ ذوق وشوق کا مسکن ومرجع بنا رہا۔

شیخ ابوالغوث نے [اغلباً ۱۱۲۶ھ/ ۱۷۱۴ء میں] لہرا میں جنگل سے قریب آبادی سے ہٹ کر اپنی ایک کٹیا آباد کی اور اپنے مریدین ومتوسلین کے ساتھ یادِ حق میں مشغول ہوگئے۔ یہاں ان کو ابتدا میں مکمل خلوت اور گوشۂ تنہائی حاصل رہی، اطمینان وسکون کے ساتھ ضربِ حق کا موقع ملا۔ جس مقصد کی تلاش میں وہ یہاں آئے تھے وہ انھیں کامل طور پر ملا، مگر یہ اطمینان وتنہائی زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکی۔ اطراف کے گاؤں دیہات میں جب ان کے لہرا میں فروکش ہونے کی خبر پھیلی تو دیدوزیارت اور دعا کے لیے لوگوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ معاملہ جب قابو سے باہر ہوگیا اور لوگوں کا ہجوم روز بہ روز بڑھنے لگا تو شیخ نے شبِ جمعہ کو زیارت ودعا اور تقسیم تبرکات کے لیے مخصوص کردیا اور بقیہ دنوں میں لوگوں کو آنے سے منع کردیا۔

منع کرنے کے بعد واقفین تو آنے سے رک گئے، مگر دور دراز کے لوگ جو معمولات سے ناواقف تھے، ان کے آنے کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔ لوگوں کی بہ کثرت آمد کی وجہ سے شیخ کا دل اس ویرانے سے بھی اچاٹ ہونے لگا اور اس گوشۂ فراغت کو چھوڑنے کا خیال دل میں

شدت کے ساتھ آنے لگا۔تحری واستخارہ کے ذریعے شرحِ صدر حاصل کرنے کی کوشش کی تو اشارہ ملا کہ اِنھی عوارضات اور شہرت سے بچنے کے لیے اپنے اجداد کے آستانے بھیرا کو چھوڑ کر اس ویرانے میں آئے تھے، اب تقدیر الٰہی یہی ہے تو پھر ہٹنا مناسب نہیں ہے۔

الہ آباد مرشد کی خدمت میں

ایک دن شیخ ابوالغوث ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے جس میں اولیا اور اہل حقیقت کے اسفار اور فتوحات کا ذکر تھا۔ اس کتاب سے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ سفر کرنا چاہیے اور بزرگوں کی خدمت میں حاضری دینی چاہیے۔اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ کدھر کا رخ کیا جائے؟ مرشد کی خدمت میں حاضری سے بہتر بھلا کیا ہوسکتا ہے، سفر بھی ہوجائے گا اور شیخ کے فیوض و برکات بھی مل جائیں گے۔سوالہ آباد کا قصد کر کے تن تنہا لہرا سے نکلے اور دو دن اور دو رات کا سفر کر کے پیرومرشد حضرت سید فتح محمد کی خدمت میں پہنچے۔مرشد نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا، جب تک قیام رہا مسلسل مرشد کے ساتھ ہی رہے۔ دورانِ قیام حضرت سید فتح محمد کا سیدانہ کے اطراف میں وسونتی عرف رسول پور اور دیگر مواضعات کا سفر ہوا تو شیخ ابوالغوث بھی سفر میں ساتھ رہے۔

اس سفر میں شیخ ابوالغوث کی مرشد کی خدمت میں حاضری خاصی طویل رہی، اس دوران دو مرتبہ رخصت کی اجازت چاہی مگر مرشد نے اجازت نہیں دی۔ ایک دن عصر کی نماز کے بعد شیخ ابوالغوث کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور فرمایا کہ میں نے تمھاری رخصت کی درخواست پر جو ابھی تک توقف کیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اشارۂ غیبی کا منتظر تھا۔اب جب کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اشارہ ملا ہے کہ تمھیں وحدت آباد لہرا میں مستقل قیام کرنا ہے اور النکاح من سنتی پر عمل کرتے ہوئے دوسرا نکاح کر کے اپنی خانہ آبادی کرنی ہے۔اب میں تمھیں رخصت کی اجازت دیتا ہوں۔اس کے بعد کچھ نصیحتیں فرمائیں اور تاکید کی کہ ہر حال میں ان پر کاربند رہنا۔ وہ نصیحتیں یہ ہیں:

۱- مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ سمجھنا جسمانی دوری کو عین وصل خیال کرنا۔

۲- بے خودی کی حالت میں بھی اللہ کو فراموش نہ کرنا، کیوں کہ یہ عمل قرب خداوندی میں اضافہ کا سبب ہوتا ہے۔

۳- ایک لحظہ کے لیے بھی ناحق کے ساتھ نہ ہونا۔

۴- ایک قدم بھی ناحق کے ساتھ نہ چلنا۔

۵- راہِ عشق میں راسخ و ثابت قدم رہنا۔

۶- اطاعت و ریاضت اللہ کے قرب کے حصول کے لیے کرنا، نہ اس لیے کہ آخرت میں جنت میں بلند مقام حاصل ہوگا، حوروں کی مصاحبت ہوگی، محلوں میں جگہ ملے گی اور دنیا کے معاملات آسان ہوجائیں گے۔ اگر تمھارے دل میں ان چیزوں کا وسوسہ پیدا ہوتو اس کو برا سمجھنا۔ صاحب ہمت و عزیمت انسان وہ ہے جو خدا کی ذات کا طالب ہو، اور آرزو کے سینے کو حسرت کے ناخن سے کھرچ ڈالے۔

نصیحت کے بعد مرشد نے شیخ ابوالغوث کو بعض نادر تبرکات سے نوازا، ان میں ایک تبرک بیت اللہ شریف کا مصلیٰ بھی تھا۔ مصلیٰ کے سلسلے میں خاص تاکید فرمائی اور بہ وقت رخصت تاکید و اہتمام کے ساتھ فرمایا کہ 'میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ ہر وقت اور ہر آن صورتاً و معناً میری توجہ تمھاری طرف رہے گی۔' اس کے بعد رخصت کیا اور شیخ ابوالغوث دو دن اور دو رات کا سفر کر کے واپس وحدت آباد لہرا پہنچے۔

لہرا میں مستقل قیام اور عقد ثانی

چوں کہ مرشد کی ہدایت تھی کہ اب لہرا ہی میں مستقل اقامت اختیار کرنی ہے اور عقد ثانی کرنا ہے، اس لیے لہرا پہنچنے کے بعد مرشد کی ہدایت پر عمل کرنے لیے مستقل اقامت کے انتظامات میں لگ گئے، بھیرا ولید پور اور اس کے اطراف کی زمینوں اور جاگیروں کا انتظام اپنے چھوٹے بھائی شیخ احمد شاہ کے سپرد کیا اور دیگر ضروری انتظامات سے فارغ ہوکر مستقل اقامت کی نیت سے لہرا پہنچے۔ مستقل اقامت کے لیے لہرا میں جن اشیا کی ضرورت تھی، انھیں بہم پہنچایا اور پھر چند دنوں کے بعد عقد ثانی فرمایا۔ یہ عقد شیخ المشائخ غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کی دختر سے اندازاً

۱۱۲۷ یا ۱۱۲۸ھ [۱۷۱۵ء یا ۱۷۱۶ء] میں ہوا۔ شیخ غلام رسول مصطفیٰ آباد کے رہنے والے تھے، عالی مرتبت اور اپنے وقت کے اعیان و اکابر کے سرخیل تھے۔ اہل اللہ اور اہل دل سے کامل وابستگی رکھتے تھے، بلکہ خود ان کا شمار بھی انھیں میں ہوتا تھا۔

تبرکات

مرشد کی طرف سے بطور تبرک بیت اللہ شریف کا جو مصلیٰ ملا تھا، شبِ جمعہ کو اس کی دید و زیارت کا معمول بنایا۔ مریدین و متوسلین کے علاوہ باہر کے مشتاق لوگ بھی اس کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے۔ دو گھڑی زیارت کا وقت ہوتا، اس کے بعد محفل سماع سجتی اور مولودی صلاۃ، غزل اور قصیدے کے اشعار ترنم کے ساتھ پڑھے جاتے جس میں سننے والوں پر اور خاص طور سے شیخ ابوالغوث پر وجد و حال طاری ہو جاتا۔ افاقہ کے بعد مجلس برخاست ہوتی اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے۔

سید غلام نظام الدین عرف حضرت راجی سید خیر اللہ سے تعلقات

سید غلام نظام الدین عرف حضرت راجی سید خیر اللہ، سید غلام محی الدین عرف حضرت راجی سید احمد حلیم اللہ کی پاک نہاد اولاد اور ان کے جانشین تھے۔ مریدوں اور طالب علموں کی تربیت کے سلسلے میں اللہ انھیں حیرت انگیز ملکہ عطا فرمایا تھا۔ عجیب و غریب احوال و کیفیات کے بزرگ تھے۔ ان کا قیام عموماً محمد آباد گوہنہ میں رہتا تھا۔ شیخ ابوالغوث کے ساتھ ان کی صحبتِ گرم اور مجلسِ شوق جمتی رہتی تھی۔ بسا اوقات شیخ ابوالغوث ان کی صحبت و زیارت کے اشتیاق میں وحدت آباد دلہرا سے تین کروہ کا فاصلہ راتوں رات طے کر کے محمد آباد پہنچتے اور لطفِ صحبت حاصل کرتے۔

دونوں حضرات میں بے حد انسیت و محبت تھی اور دونوں ایک دوسرے کا بے حد احترام و لحاظ کرتے تھے۔ سید خیر اللہ ایک مرتبہ ملاقات کے لیے وحدت آباد دلہرا تشریف لے گئے، شیخ ابوالغوث نے خوب خاطر مدارات کی اور پوری مستعدی کے ساتھ حقِ خدمت ادا کرنے میں مصروف رہے۔ سید خیر اللہ ان کی سعادت مندی اور خدمت گزاری سے بے حد خوش ہوئے اور

اقوال واحوال کے مشاہدے کے بعد فرمایا کہ 'حق تعالی نے آپ کو جو صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، وہ دوسروں میں بہت کم نظر آتی ہیں۔' قدر دانی کے یہ کلمات انھوں نے متعدد بار دہرائے اور خوشی کا اظہار کیا۔

رات میں سونے کے وقت شیخ ابوالغوث نے اپنی چادر بجائے بستر پر بچھانے کے سید خیراللہ کے قدموں میں بچھا دی اور سونے لگے۔ سید خیراللہ نے جب دیکھا تو فرمایا کہ 'واللہ! میں یہ جسارت نہیں کرسکتا کہ اپنا پاؤں آپ کی طرف کروں۔ حق تو یہ ہے کہ آپ کی چادر کو میں تبرک سمجھ کر اٹھالوں اور اسے اپنی دستار بناؤں۔'

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ سید خیراللہ کے والد ماجد راجی سید احمد حلیم اللہ [۱] کے عرس کی تقریب کے موقع پر سید خیراللہ کے پاس محمد آباد قصبے کے اکابر و اعیان اور ائمہ کرام بیٹھے ہوئے تھے اور ایک بڑی تعداد باہر کے مہمانوں کی بھی تھی جس میں مانک پور، غازی پور اور جون پور کے مشاہیر و اکابر تھے۔ محفل سماع چل رہی تھی کہ اچانک شیخ ابوالغوث تن تنہا بے تکلف قلندرانہ لباس زیب تن کیے پہنچ گئے۔ سید خیراللہ کی نگاہ پڑی تو اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور چند قدم آگے بڑھ کر استقبال کیا اور بہ کمال شفقت اپنے پاس بٹھایا۔ اہل مجلس نے جب ایک اتنے کم عمر شخص کی اتنی تعظیم و تکریم دیکھی تو انھیں کوفت ہونے لگی۔ سید خیراللہ نے مجلس کا رنگ بدلتے دیکھا تو معاملہ کو بھانپ لیا، اہل مجلس کو خطاب کر کے فرمایا کہ 'اس وقت اہل تصوف کے درمیان ابوالغوث فریدِ وقت ہیں، کیوں کہ حضرت گنج شکر کے سلسلے میں ان کے خانوادۂ حق پرست نے آج تک ان سے بہتر خلیفہ کسی کو نہیں بنایا ہے۔ یہ ایسی شمع ہیں جن کے انوارِ ولایت کو مشائخ سلف کے خانوادے نے روشن کیا ہے، یہ وہ آفتاب ہیں جس کا پرتو ثری سے ثریا تک پہنچا ہوا ہے، ان کی حیثیت قلوب العارفین کی ہے، اس لیے میں نے ان کو صدرِ مجلس میں بٹھایا ہے کہ قلب کی جگہ صدر ہی ہوتی ہے۔ یہ ہر حال میں ربِ جلیل کے دوست ہیں، ان کے درجات سے حسد کرنے والا اللہ کا دوست نہیں ہوسکتا۔'

سید خیراللہ کی بات ختم ہوئی تو پھر محفل سماع شروع ہوگئی۔ سید خیراللہ پر درمیانِ سماع حال طاری ہوگیا، شیخ ابوالغوث نے حال میں ان کا ساتھ دیا۔ دورانِ حال سید خیراللہ نے شیخ

ابوالغوث کے سر سے دستار اتار لی اور اپنا دستِ مبارک ان کے سر پر رکھ کر یہ شعر پڑھا:

خدائے جہاں را ہزارا سپاس
سپردیم گوہر را گوہر شناس

خدائے عالم کا ہزار ہاہزار شکر ہے کہ ہم نے گوہر گوہر شناس کے حوالے کیا ہے۔

محفل سماع ختم ہونے کے بعد باقاعدہ سید خیر اللہ نے شیخ ابوالغوث کو امانتِ خلافت عطا فرمائی اور انھیں اجازتِ بیعت مرحمت فرمائی۔

سید غلام معین الدین عرف حضرت راجی دانی سے ملاقات اور خلافت

سید غلام معین الدین عرف حضرت راجی دانی، سید خیر اللہ کے بڑے بھائی تھے، انتہائی بابرکت اور عظیم المرتبت انسان تھے۔ ان کو اپنے والد سید احمد حلیم اللہ اور راجی سید ابراہیم قدس سرہما سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ دیار جون پور کے صاحبِ ولایت تھے اور مستقل قیام جون پور ہی میں تھا۔ کسی تقریب سے محمد آباد ان کی آمد ہوئی تو شیخ خیر اللہ ان کو لے کر وحدت آباد لہرا پہنچے۔ شیخ ابوالغوث نے دونوں بزرگوں کی آمد اپنے لیے سعادت سمجھی اور دل وجان سے میز بانی میں لگ گئے اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر جنگل اور ویرانے میں کیسی ضیافت کا انتظام ہوسکتا ہے۔ جب دسترخوان لگا تو شیخ ابوالغوث نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا کہ 'آپ حضرات کی آمد کی وجہ سے اس درویش کا ویرانہ رشکِ جنت بن گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ضیافت میرے لیے ابدی سعادت ثابت ہوگی، لیکن آپ لوگوں کی شایان شان اس جنگل میں ضیافت کا انتظام نہ ہوسکا۔ جو کچھ نان ونمک میسر ہے، شرفِ قبولیت کی امید کے ساتھ حاضر ہے۔'

حضرت راجی دانی نے شیخ ابوالغوث کے صدقِ خلوص کی تحسین کی اور فرمایا کہ 'دل مضبوط رکھیے، جلد ہی حق تعالی اس ویرانے کو آبادی میں بدل دے گا اور یہاں ہر طرح کی اشیا کی ارزانی ہوگی۔' اس کے بعد شیخ ابوالغوث کے حال پر توجہ فرمائی اور بہ وقت رخصت پیرانِ چشت کی امانت اور خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور خدا کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ 'پیرانِ چشت کی امانت مرکزِ حق تک بہ سلامت پہنچ گئی۔'

الہ آباد کا ارادۂ سفر

۱۱۳۰ھ [۱۷۱۸ء] میں شیخ ابوالغوث نے پیر و مرشد حضرت سید فتح محمد کی خدمت میں حاضری کا عزم کیا اور تن تنہا کسی کو اطلاع کیے بغیر الہ آباد کے ارادے سے نکلے، مگر بوجوہ الہ آباد نہیں پہنچ سکے۔ نظام آباد کے راستے سے جون پور پہنچے، جون پور میں اہل قرابت و احباب سے ملاقات کی اور وہیں سے واپس لہرا آ گئے۔

اس سفر میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ نظام آباد کے پاس ایک گاؤں میں جس میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، شیخ ابوالغوث کو رات گزارنے کا اتفاق ہوا۔ اس گاؤں میں ایک پنڈت تھا جو مسلمانوں کے نام سے بدکتا تھا۔ شیخ گاؤں میں جب رات بسر کرنے کے ارادے سے پہنچے تو کسی نے شرارت کی اور اسی پنڈت کے گھر کی رہنمائی کر دی۔ شیخ جب اس کے گھر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ حلقۂ مریداں لگائے بیٹھا ہوا ہے۔ جب قریب پہنچے اور اس کی نگاہ پڑی تو بے ساختہ وہ ملاقات کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، شیخ کی طرف عجلت سے بڑھا، پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ ملا اور اپنی نشست پر لا کر بٹھایا۔ جب اس کے مریدوں نے دیکھا کہ مقتدا ہی سامنے بچھے جا رہا ہے تو ناچار وہ سب بھی خدمت کے لیے آگے بڑھے۔

اکرام و ضیافت کے بعد شیخ نے اپنا سامان ایک درخت کے نیچے رکھوایا اور وہیں اپنا بوریا بستر کھول کر یادِ حق میں مشغول ہو گئے۔ پنڈت کے مریدوں میں سے ایک شخص شیخ سے اتنا متاثر ہوا اور ان کا طریقۂ عبادت و ریاضت اسے اتنا بھایا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ صبح پنڈت کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ چند اوباشوں کو ساتھ لے کر بدتمیزی کے ارادے سے شیخ کے پاس آیا، مگر قریب پہنچنے کے بعد کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ شیخ نے اس نومسلم کو ضروری اور بنیادی تعلیمات سے آگاہ کر کے اور نصیحتیں فرما کر اس گاؤں کے بغل میں ایک دوسرے گاؤں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، بھیج دیا اور اپنا سامانِ سفر اٹھا کر وہاں سے کوچ کیا۔

جون پور پہنچے تو اہل قرابت یا مشاہیر جون پور کے پاس ٹھہرنے کی بجائے غریبوں کے ایک محلے میں اترے اور وہیں قیام کیا۔ اس درمیان اکابرِ جون پور کے پاس شیخ ابوالغوث کے

بھائی شیخ احمد شاہ کا خط پہنچ چکا تھا کہ بڑے بھائی شیخ ابوالغوث بغیر اطلاع کے یہاں سے سفر پر نکل گئے ہیں، اگر جون پور پہنچیں تو انھیں بہ لطائف الحیل میرے آنے تک روک کر رکھیں، آگے نہ جانے دیں۔اس خط کے ملنے کے بعد جب اکابرِ جون پور کو آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو ملاقات کے لیے آئے اور باصرار آگے جانے سے باز رکھا اور وطن واپس لوٹنے پر مجبور کیا۔

روح آباد/ کچھوچھہ کا دوسرا سفر

الہ آباد کا سفر چوں کہ ناقص رہا، سفر سے جو مقصود و مطلوب تھا یعنی اہل اللہ کی زیارت، ان کے مزارات پر حاضری اور ان کے فیوض برکات سے مستفیض ہونا، وہ حاصل نہیں ہوا۔ اس لیے شیخ کے دل و دماغ سے سفر کا خیال نکلا نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد کچھوچھہ شریف جانے کا دل میں شدید داعیہ پیدا ہوا۔حصولِ سعادت اور سید اشرف جہاں گیر نور اللہ مرقدہ کے مرقد مبارک کی زیارت کی نیت سے نکل پڑے۔ راستے میں شمس پور میں پڑاؤ کیا اور شیخ مرتضیٰ صدیقی کی خانقاہ میں قیام کیا۔ شیخ غلام علی عرف شیخ جنکا جو حضرت مخدوم شیخ محمد عیسیٰ تاج کی اولاد میں سے ہیں، صاحبِ نسبت اور جہاں دیدہ عارف تھے، وہ اتفاق سے ان دنوں شمس پور میں کسی تقریب سے اقامت گزیں تھے۔ ان سے بھی شیخ ابوالغوث کی ملاقات ہوئی اور ان کی مربیانہ شفقت و رافت سے نہال ہوئے۔

شمس پور کے اطراف ہی میں کہیں کسی گاؤں میں شیخ کے مرید باصفا اور سوانح نویس شیخ شمس الدین حیدری بہ سلسلہ معاش مقیم تھے۔ شیخ کو ان کے بارے میں جب علم ہوا تو فوراً ایک شخص کو بھیج کر ان کو شمس پور بلوایا اور قدم بوسی کی عزت بخشی۔

ہفتہ عشرہ شمس پور میں قیام رہا، اس کے بعد وہاں سے نکلے تو شیخ شمس الدین حیدری بھی ساتھ میں تھے، ان کی درخواست پر اس گاؤں بھی تشریف لے گئے جہاں وہ معاشی ضرورت سے مقیم تھے۔ وہاں سے جب نکلے تو شیخ شمس الدین حیدری نے درخواست کی کہ میں بھی ساتھ کچھوچھہ شریف چلنا چاہتا ہوں، مگر شیخ نے ان کو روک دیا اور وہاں سے تنہا نکل کھڑے ہوئے۔

راستے میں سید العارفین سید شاہ راجا[۲] اور مولانا شاہ رمضان کے یہاں ٹھہرتے

ہوئے اوران کے انوار و برکات سے شادکام ہوتے ہوئے کچھو چھہ پہنچے۔ارادہ تھا کہ چند دن وہاں قیام کر کے دیگر اہل اللہ سے ملاقات کے لیے مزید کچھ دن سفر میں گزاریں گے، اس کے بعد وطن واپس ہوں گے، مگر کچھو چھہ میں اقامت کے ایام میں اشارہ ملا کہ سفر اگر چہ وسیلۂ ظفر ہے، اس سے اہل اللہ کے فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں، مگر تمھارے لیے حکم یہ ہے کہ تم اپنے آستانے پر بیٹھے رہو، کہیں جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ شیخ نے اس اشارے پر سمعنا و اطعنا کہا اور واپس وحدت آباد لہرا آ گئے۔

کچھو چھہ کا مذکورۃ الصدر سفر ۱۱۳۰ھ یا ۱۱۳۱ھ [۱۷۱۸ء یا ۱۷۱۹ء] میں ہوا تھا۔ واپسی کے بعد تعمیل حکم میں جم کر لہرا میں بیٹھے رہے اور ۱۱۳۹ھ [۱۷۲۶ء] تک کسی طویل سفر کے لیے وحدت آباد سے قدم نہیں نکالا۔ ۲۱ محرم ۱۱۴۰ھ [۸-اکتوبر ۱۷۲۷ء] کو عرس میں شرکت کے لیے کچھو چھہ کا تیسرا سفر کیا، جس کا ذکر آگے آئے گا ان شاء اللہ۔

ایک سال کا اعتکاف اور فرزند کی وفات

۱۱۳۶ھ [۱۷۲۴ء] میں شیخ ابوالغوث نے پورے سال کے اعتکاف کی نیت کی اور چار رمضان کو اعتکاف بیٹھ گئے۔ رجب ۱۱۳۷ھ [مارچ ۱۷۲۵ء] کو فرزند رشید قطب الدین جو دوسری اہلیہ کے بطن سے تھے، سخت بیمار ہوئے۔ علاج و معالجہ ہوا، مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ جب موت کا وقت قریب آیا اور سکرات کے آثار ظاہر ہونے لگے تو گھر کی عورتیں نالہ و شیون کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوئیں اور چل کر دیکھنے اور توجہ کی درخواست کی، مگر شیخ کو اعتکاف فسخ کرنا گوارا نہ ہوا اور حسبِ سابق اپنے اوراد و اشغال میں لگے رہے۔ ۱۶ رجب کو اس معصوم نے جان جاں آفریں کے سپرد کی اور جسم کی کثافت سے ہلکا ہو کر خالق حقیقی کے پاس جا پہنچا۔

کچھو چھہ کا تیسرا سفر اور عرس میں شرکت

۲۱ محرم ۱۱۴۰ھ [۸-اکتوبر ۱۷۲۷ء] کو سید اشرف جہاں گیر رحمہ اللہ کے عرس میں شرکت کے لیے کچھو چھہ کا تیسرا سفر کیا۔ عرس ۲۸ محرم کی رات کو ہوتا ہے، شیخ پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔ عرس سے پہلے کے ایام روضے کے ایک گوشے میں بسر کیے اور خود کو دوسروں کی نگاہ سے

پوشیدہ رکھا۔عرس کی رات سجادہ نشین سید جمال اشرف [۳]اعیان واتباع کی ایک جماعت کے ساتھ روضے کے پاس پہنچے۔ وہاں کی قدیم رسم ہے کہ عرس کے دن صاحبِ سجادہ حضرت سید اشرف جہاں گیر کا خرقہ پہنتے ہیں اور ایک شخص پانی سے لبریز سبو اٹھاتا ہے جس میں صاحبِ سجادہ اپنا ہاتھ ڈالتے ہیں، ان کی متابعت میں حاضرین بھی اسی طرح کا عمل کرتے ہیں۔ گانے والے آگے آگے گاتے ہوئے چلتے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے صاحبِ سجادہ مزارِ مبارک کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب خلقِ خدا خرقہ وسبو کی زیارت کے لیے پروانہ وار ٹوٹ پڑتی ہے اور ایک ہنگامہ برپا ہوجاتا ہے۔شیخ ابوالغوث کے دل میں خرقے اور سبو کی زیارت کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ دور ہونے کے باوجود کراماتی طور پر صاحبِ سجادہ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔شیخ کو دیکھ کر صاحبِ سجادہ اور ان کے اردگرد موجود اکابر واعیان باادب ہو گئے۔

عرس کی رات کے بعد صاحبِ سجادہ اور دیگر اکابر جنھوں نے عرس کی رات شیخ ابوالغوث کو دیکھا تھا، خاص طور سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور جب تک شیخ کا وہاں قیام رہا، پابندی کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور آپ سے استفادہ کرتے رہے۔ دوران ملاقات کئی بار ان لوگوں نے وحدت آباد خانقاہ کی زیارت کی اجازت چاہی، مگر شیخ بہ لطائف الحیل ان کی درخواست ٹال دیتے۔

کچھوچھہ میں دو ہفتے قیام رہا، وہاں سے لوٹتے ہوئے حضرت مولانا شاہ رمضان قدس سرہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور دورات مواصلتِ روحانی سے محظوظ ہوئے۔ وہاں سے غوث پور کے ارادے سے نکلے اور راستے میں سلطان الواصلین سید شاہ راجا کی زیارت کرتے ہوئے غوث پور پہنچے۔ وہاں تھوڑے دنوں قیام کر کے شمس پور میں نزول کیا، وہاں سے آگے سفر کا ارادہ تھا مگر وطن کے تقاضوں نے دامن دل کھینچنا شروع کر دیا۔ لہٰذا آگے جانے کی بجائے شمس پور سے وحدت آباد دلہرا لوٹ آئے۔

علالت وصحت

کچھوچھہ سے لوٹنے کے بعد طبیعت ناساز ہوگئی بلکہ دورانِ سفر ہی بخار کا اثر ہو گیا تھا۔ وطن پہنچنے کے بعد بخار نے شدت پکڑ لی۔ گھر کی مستورات نے علاج ومعالجہ کا اہتمام شروع کیا،

گرم دوائیں استعمال کرائی گئیں، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ شیخ کا مزاج چوں کہ خود گرم تھا، اس پر سے گرم دواؤں کا استعمال، نتیجہ یہ ہوا کہ افاقہ کی بجاے بخار میں اضافہ ہوگیا۔ کمزوری بے حد بڑھ گئی، ناطاقتی کا یہ عالم ہوا کہ بغیر سہارے کے چلنا مشکل ہوگیا، متواتر فاقے اور مسلسل بخار کی وجہ سے بات کرنے کی سکت بھی ختم ہوگئی۔ اسی درمیان میلاد کی رات آگئی، خدام نے اطلاع دی تو کہا کہ میں خود ثواب فاتحہ کے لیے آؤں گا۔ ثواب فاتحہ کا جب وقت آیا تو لوگوں نے صدرِ مجلس میں لاکر بٹھایا۔ شیخ کے مرید خاص و ارادت مند شیخ خضر محمد [جو شیخ کی بارگاہ میں تقرب خاص رکھتے تھے اور کبھی کبھی شیخ ان کی خوش نغمگی سے ذوق بھی فرماتے تھے] اور ان کے دو چار ہم مشرب دوستوں نے جو اس فن میں کمال کا درجہ حاصل کیے ہوئے تھے، شیخ کا اشارہ پا کر نغمہ سرائی کے لیے کھڑے ہوئے۔ جیسے ہی محفل سماع شروع ہوئی، شیخ کی کیفیت بدل گئی، لذتِ سماع سے ایسا وجد و حال طاری ہوا کہ حاضرین کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، لوگ حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے اور بخار کا نام و نشان تک زائل ہوگیا۔ گویا مجلس سماع نے شیخ کے لیے معجون مفرح کا کام کیا۔

الہ آباد کا سفر

جمادی الثانیہ ۱۱۴۰ھ [جنوری ۱۷۲۸ء] کو شیخ ابوالغوث کے مرشد حضرت سید فتح محمد کے صاحب زادے شاہ ظہور محمد کے متواتر کئی خطوط آئے جس میں ان کو الہ آباد بلایا گیا تھا۔ شیخ کو صاحب زادۂ محترم سے بھی اجازت و خلافت حاصل تھی۔ شیخ نے اپنے لوگوں سے مشورہ کیا اور سفر پر آمادگی کا اظہار کیا۔

رجب ۱۱۴۰ھ [فروری ۱۷۲۸ء] کو وحدت آباد سے ایک مختصر قافلے کے ساتھ الہ آباد کے لیے نکلے، راستے میں کچھ دن جون پور میں قیام کیا اور وہاں اہل قرابت و احباب سے ملاقات کی۔ جون پور سے نکلے تو اتفاق سے قافلہ راستہ بھٹک گیا اور ایک ایسے گاؤں کے قریب جا پہنچا جو غیر مسلموں اور ڈاکوؤں کا گاؤں تھا۔ واقفِ حال لوگوں نے عرض کیا کہ یہ مخالفین کا گاؤں ہے، گاؤں میں جانا خلافِ مصلحت ہے۔ شیخ نے پُر اعتماد انداز میں کہا کہ گاؤں میں ہم داخل ہوں گے، وہاں چل کر تم لوگ اللہ کی قدرت دیکھنا۔ قافلہ کے لوگوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر لکڑی اور

اینٹ لے لیے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی مکھیا کا مکان تھا، جہاں ایک بلند جگہ پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہ جب اہل قافلہ پر پڑی تو فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور دوڑتے ہوئے قافلہ کے پاس آئے۔ پہلے تو قافلہ والوں نے سمجھا کہ وہ بری نیت سے آرہے ہیں، مگر جب قریب پہنچے اور اعزاز واکرام کا معاملہ شروع کیا تو قافلہ کے لوگ مطمئن ہوگئے اور اللہ کی مدد ونصرت کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا۔ گاؤں کے لوگوں نے مکھیا کا مکان کھول کر بٹھایا، شربت اور کھانے وغیرہ سے ضیافت کی اور رات گزارنے کی درخواست کی، مگر شیخ ابوالغوث نے رات رکنے سے معذرت کرلی اور الہ آباد کی طرف کوچ کیا۔

الہ آباد پہنچے تو سیدھے مرشد کے آستانے پر حاضری دی اور کسبِ فیض کے لیے چند دن مسلسل آستانے کی مجاورت اختیار کی۔ الہ آباد کے قیام کے دوران وحدت آباد لہرا سے شیخ شمس الدین حیدری نے متواتر کئی خطوط حضرت شاہ ظہور محمد کے نام روانہ کیے، جس کا مضمون یہ تھا کہ آستانہ وحدت آباد لہرا کے متعلقین حضرت کی مفارقت میں جاں بہ لب ہیں اور آمد کے منتظر ہیں۔ وحدت آباد کے لوگوں کی یہ تڑپ حضرت شاہ ظہور محمد نے دیکھی تو فوراً رخصت ہونے کی اجازت دے دی اور ڈھیر ساری نعمت وامانت کے ساتھ وحدت آباد کے لیے روانہ کیا۔

حواشی

۱- سید احمد حلیم اللہ ابن سید مجتبیٰ مانک پوری نے اپنے والد سے دینی علوم حاصل کیے اور والد ہی سے سلسلۂ چشتیہ میں اجازت وخلافت حاصل کی۔ بڑے بلند مرتبہ انسان اور صاحبِ کرامت بزرگ تھے، ان کے بعض مریدوں نے 'الخوارق الاحمدیہ' کے نام سے ان کی کرامتوں کو جمع کیا ہے۔ [قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۲۵۸]

بحر زخار میں ان کی ایک کرامت درج ہے کہ ہندستان میں سنویری نام کا ایک پرندہ پایا جاتا ہے۔ اس پرندے کا نام ہر علاقے میں الگ الگ ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ دوسرے پرندوں کو اپنے گھونسلے میں لے جاتا ہے اور چھ مہینے اپنے ساتھ رکھتا ہے، اس مدت میں اس پرندے کی شکل وصورت بدلتے بدلتے بالکل ہو بہو سنویری جیسی ہوجاتی ہے۔ ایک مرتبہ شیخ احمد حلیم اللہ نے فرمایا کہ تلقین وفیض

بخشی میں اگر سنو یری کے بہ قدر بھی قوت نہ ہوتو پھر فقیری کس کام کی؟ شاہ خضر نامی اپنے ایک مرید کو لے کر حجرے میں چلہ کے لیے بیٹھ گئے، چالیس دن کے بعد دروازہ کھولا تو حکم دیا کہ 'خضر پہلے تم باہر جاؤ۔' وہ باہر نکلے تو حاضرین نے سمجھا کہ شیخ احمد حلیم اللہ باہر نکلے ہیں، کیوں کہ شاہ خضر کی شکل ہو بہ ہو شیخ احمد حلیم اللہ جیسی ہوگئی تھی۔ لوگ بے اختیار پابوسی کو دوڑے۔ شاہ خضر کہتے رہے کہ میں خضر ہوں، مگر کسی نے نہیں مانا۔ جب شیخ احمد حلیم اللہ کمرے سے باہر آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ دونوں کی شکل وشباہت میں سرمو فرق نہیں ہے۔ شیخ احمد حلیم اللہ کی اہلیہ نے ایک دن کہا کہ 'پیرومرید کی شکل میں بالکل فرق نہیں ہے، اس سے پریشانی ہوسکتی ہے۔' تو شیخ احمد حلیم اللہ نے شیخ خضر کو بلا کر ان کے چہرے پر ہاتھ پھیرا، جس سے ان کے چہرے پر نشیب وفراز جیسا ایک نشان پڑ گیا، جس سے پیرومرید کی شناخت ہونے لگی۔ [شیخ وجیہ الدین اشرف، بحر زخار، مرکز تحقیقات فارسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، جلد اول، ص ۵۶۴]

شیخ احمد حلیم اللہ کے محمد آباد میں کئی مریدین تھے، دیوان محمد رشید جون پوری ان کے مشہور مرید وخلیفہ ہیں۔ ان کے بیٹے شیخ غلام محی الدین کا شمار بلند مرتبہ اہل اللہ میں ہوتا ہے۔ سید احمد حلیم اللہ کی وفات ۱۵ جمادی الاولی ۱۰۴۰ھ [۲۰ دسمبر ۱۶۳۰ء] میں ہوئی اور مانک پور کے باہر سید حامد شاہ کے روضے میں دفن کیے گئے۔ [قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص: ۲۵۸]

۲- سید شاہ راجا سلطان اشرف جہاں گیر کے اجل خلفا میں سے ہیں۔ یہ اصلاً زمین دار تھے، حق کا غلبہ ہوا تو زمین داری چھوڑ کر سلطان اشرف جہاں گیر کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور مرتبۂ ولایت کو پہنچے۔ زمین داری کے زمانے میں ان کو لوگ شاہ راجا کے نام سے پکارتے تھے اور یہ نام اصل نام پر ایسا غالب آیا کہ اصل نام فراموش ہوگیا۔ ان کا مزار قصبہ ماہل میں ہے۔ ان کے مزار کے بالیں ایک شگاف ہے، افواہی روایت ہے کہ شاہ راجا نے کہا ہے کہ جو شخص میری زیارت کے بعد اس راستے سے نکلے گا، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ [شیخ وجیہ الدین اشرف، بحر زخار، جلد اول، ص ۵۲۳]

۳- سید جمال اشرف حضرت شاہ عبدالرزاق نورالعین کی اولاد میں سے ہیں، سید محمد مکی کے خلیفہ اور سلطان اشرف جہاں گیر کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ بڑے بابرکت اور صاحبِ کمال انسان تھے۔ [حوالہ بالا، جلد اول، ص ۵۱۴]

◆ ◆ ◆

قیامِ وحدت آباد لہرا کے چند واقعات

تحمل و بردباری

ایک مرتبہ چند مفسدہ پرداز قسم کے لوگ جو بہ ظاہر درویش معلوم ہوتے تھے، لہرا آستانے پر آئے۔ خدام نے تواضع و تکریم کے ساتھ ان کو بٹھایا اور ماحضر سے ان کی ضیافت کی، مگر ان لوگوں نے ماحضر قبول کرنے سے انکار کر دیا اور پُر تکلف ضیافت کی خواہش ظاہر کی۔ رات کا وقت تھا، ویرانے میں اس وقت پُر تکلف کھانوں کا انتظام نہیں ہوسکتا تھا، سو خدام نے معذرت کر لی۔ ان لوگوں نے رات آستانے پر گزاری اور شیخ بوالغوث کے بارے میں رات میں یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی کرتے رہے۔ صبح خدام نے شیخ سے ان کی رات کی حرکتوں کا ذکر کیا تو شیخ ان کے پاس جا کر بیٹھے اور قصورِ خدمت پر معذرت چاہی، مگر وہ لوگ اتنے جری تھے کہ ان کے سامنے ہی لاف گزاف بکنا شروع کر دیا۔ شیخ نے ان سے کچھ نہیں کہا، تحمل کے ساتھ ان کی بات سنی اور پھر ان کے لیے مرغوب و مرغن کھانوں کا انتظام کرایا اور ان کی ضیافت کی۔

تحمل اور صرفِ نظر

ایک رات شیخ ابوالغوث اپنے کمرے میں مصروفِ عبادت تھے کہ ایک چور کمرے میں داخل ہوا اور سامان اٹھانے لگا۔ شیخ کو جب محسوس ہوا تو آپ نے مزید سر جھکا لیا اور مستغرق ہو گئے، تا کہ اس کے مقصود میں خلل نہ ہو۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد سامنے سے لوٹا اٹھایا اور کمرے سے باہر چلے گئے، تا کہ وہ اطمینان سے اپنا مقصود حاصل کر لے۔

توکل علی اللہ

ایک دن علاقے کا حاکم حشم وخدم اور ہاتھی گھوڑے کے ساتھ شیخ سے ملاقات کے لیے آستانے پر حاضر ہوا۔ اتفاق سے وہ دن شیخ کے خلوت کا تھا، اس لیے حاکم کی درخواست پر توجہ نہیں دی اور کمرے سے باہر تشریف نہیں لائے۔ اس نے اس کا دوسرا مطلب نکال لیا اور اپنی توہین سمجھا۔ واپس لوٹا تو حاکمانہ غرور میں اس نے شیخ کے قدیم مواضع جو اُن کے تصرف میں تھے اور بہ ظاہر معاش کا ذریعہ تھے، ان کو ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب آمدنی کے ذرائع مسدود ہو جائیں گے اور خرچ کی تنگی ہو جائے گی تو شیخ خود چل کر میرے پاس معذرت کے لیے آئیں گے۔ ضبطِ مواضع کی وجہ سے آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا، مگر شیخ نے اخراجات کو علی حالہ باقی رکھا، اس میں کوئی تخفیف نہیں کی۔ ہفتوں گزر گئے مگر حاکم کی خام خیالی شرمندۂ عمل نہیں ہوئی تو اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا کہ شیخ کس حال میں ہیں۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ سدِّ آمدنی کے باوجود اخراجات سابقہ حالت پر باقی ہیں، اور پھر اس نے شیخ کے استغنا اور توکل کو دیکھا کہ ان مواضع کی طرف بالکل توجہ نہیں دی تو اس کو تنبہ ہوا اور خدمت میں حاضر ہو کر جرم کی معافی چاہی اور ان مواضع کو بہ دستور آستانے کے وکیلوں کے تصرف میں دے دیا۔

رضا بالقضا

شیخ کے ایک نیاز مند نے حصولِ مقصد کے لیے نذر مانی تھی، جب مقصد حاصل ہو گیا تو انھوں نے شیخ شمس الدین حیدری کے توسط سے نذر کی رقم شیخ کی خدمت میں پیش کی۔ حکم ہوا کہ اس رقم سے کھانا کھلانے کا نظم کیا جائے۔ تعمیل حکم کی تیاریاں شروع ہو گئیں، برسات کا موسم تھا، مسلسل بارش ہو رہی تھی، اس لیے طرح طرح کی مشکلات پیش آ رہی تھیں اور سامان کی فراہمی نہیں ہو پا رہی تھی۔ شیخ کے ایک خادم بہاء الدین نے امساکِ باراں کے لیے کاغذ پر ایک نقش بنا کر صحن میں لٹکا دیا۔ شیخ جب اپنے کمرے سے باہر نکلے تو اس کاغذ پر نگاہ پڑی۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ شیخ شمس الدین حیدری وہاں موجود تھے، انھوں نے عرض کی کہ فلاں نے دفعِ باراں کے

لیے یہ نقش لکھا ہے۔ شیخ کا چہرہ متغیر ہوگیا اور فرمایا کہ 'اسے جلدی ہٹاؤ، ایسی نامناسب حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ بندہ کے اوپر لازم ہے کہ ہمیشہ رضاے الٰہی کے مطابق چلے، مرضیات الٰہی کے خلاف کمر نہ باندھے۔'

اس کے بعد اسی کے مناسب حال ایک واقعہ بیان فرمایا:

کسی شہر میں ایک صاحبِ کرامت بزرگ معتکف تھے، برسات کے دنوں میں دریا کا پانی بہت اوپر آ گیا، قریب تھا کہ شہر میں پانی آنا شروع ہو جائے۔ شہر کے لوگ پریشان ہو کر ان بزرگ کے پاس گئے اور درخواست کی کہ 'اگر دریا کی جانب آپ چلیں تو آپ کے جانے کی برکت سے دریا کا پانی اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھے گا۔' وہ بزرگ لوگوں کی دل جوئی کے لیے دریا کی طرف گئے تو دیکھا کہ دریا کا بہاؤ شہر کا رخ کر رہا ہے۔ انھوں پھاوڑا مانگا اور نہر کو شہر کی جانب کھودنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ 'آپ کے آنے کا مقصد دریا کے پانی کو شہر میں داخل ہونے سے روکنا تھا، نہ کہ شہر میں داخل کرنا۔' انھوں نے کہا کہ 'بندہ کو اللہ کی رضا کی رعایت کرنی چاہیے، جب مرضیِ الٰہی یہی ہے تو میں بھی وہی کر رہا ہوں، تاکہ پانی جلد شہر تک پہنچ جائے۔ جب سارے زمانے کے لوگ اپنے دنیاوی آقا و بادشاہ کے حقوق کی ادائیگی اور اس کی طرف داری میں محنت کرتے ہیں تو میں کیسے اس خدا کی مرضی کے خلاف چلوں جو حقیقی منعم اور میری جان کا مالک ہے۔'

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تبرک

محمد خرم نامی ایک بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کے ساتھ لہرا کے اطراف میں تشریف لائے۔ ان کے جملہ تبرکات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو موے مبارک بھی تھے، جسے وہ حفاظت سے ایک صندوق میں رکھے رہتے تھے اور جہاں بھی جاتے لوگوں کو اس کی زیارت سے فیض یاب کرتے۔ حسن اتفاق کہ وہ وحدت آباد بھی تشریف لائے اور شیخ ابوالغوث نے زیارت کی سعادت حاصل کی اور ان کی خوب مہمان نوازی کی۔ محمد خرم نے لہرا میں چند دن قیام کیا۔ بارش کے دن تھے، مسلسل موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے

شیخ کے کمرے کی دیوار شق ہوکر گرنے کے قریب ہوگئی۔ ایک رات شیخ نصف شب میں صحنِ خانہ میں ٹہل رہے تھے، محمد خرم آئے اور پورے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ چند اربابِ صلاحیت ہیں، جن کی پیشانی سے رشد و فلاح کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور انوارِ سعادت سے ان کی جبینِ اخلاص چمک رہی تھیں۔ میں صدقِ دل سے اس جماعت کی خدمت میں حاضر ہوا، کمالِ ذرہ پروری سے ان لوگوں نے میری طرف نگاہِ لطف و کرم کی اور مجھے ہم کلامی کے شرف سے نوازا۔ اس جماعت کے ایک شخص جو دیکھنے میں اس جماعت کے سربراہ لگ رہے تھے، مجھ سے مخاطب ہوئے کہ اس وقت ابوالغوث کی صحبت و تقرب تم کو حاصل ہے، وہ اِس وقت کے بہترین رجال اللہ میں ہیں۔ ان کے حجرے کی دیوار پھٹ گئی ہے، جس کی وجہ سے ان کی طبیعت پریشان ہے، تم ان کے پاس جا کر میرا پیغام پہنچا دو کہ وہ صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کی زیارت کا اہتمام کریں اور اس آثارِ مبارک کے غسالہ کو دیوار پر چھڑک دیں اور سارے اندیشے کو دماغ سے نکال دیں۔

اور دوسری بات یہ کہ آثار شریف کے دو قطعے اس وقت تمھارے پاس ہیں، ان میں سے ایک ابوالغوث کے حوالے کر دو۔ چنانچہ حسبِ حکم انھوں نے ایک موے مبارک شیخ ابوالغوث کے حوالے کیا اور چند دن قیام کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہوئے۔

شیخ شمس الدین حیدری کا خواب اور اس کی تعبیر

شیخ شمس الدین حیدری، شیخ ابوالغوث کے مرید باصفا تھے۔ ایک رات انھوں نے خواب دیکھا کہ ان کی بیوی ایک بچے کو اپنی گود میں لیے شفقتِ مادری نچھاور کر رہی ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بچے کو ان کی گود میں دے دیا۔ صبح کو یہ خواب انھوں نے شیخ کے گوش گزار کیا اور تعبیر چاہی، تو فرمایا کہ بہترین خواب ہے۔ اس کی واضح تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں ایک فرزند عطا فرمائیں گے۔

شیخ شمس الدین حیدری تعبیر سننے کے بعد انتظار میں لگ گئے۔ ایک سال گزر گیا مگر خواب کی تعبیر ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ ایک دن شیخ شمس الدین نے موقع دیکھ کر عرض کیا کہ خواب کو

پورا ایک سال گزر گیا ہے، مگر تعبیر تا حال ظاہر ہوتی نظر نہیں آتی۔ شیخ نے تھوڑی دیر سر جھکایا، اس کے بعد کہا کہ 'یہ کیسے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر پوری نہیں ہوگی؟ کیا تم نے نہیں سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی نے خواب دیکھا اور اس کی تعبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ کسی ایک غزوہ میں اسلام کو مکمل فتح حاصل ہوگی، کفار شکست کھائیں گے اور اسلام پوری طرح سے غالب ہو جائے گا۔ تھوڑے دنوں کے بعد کفار سے پھر مقابلہ ہوا اور اتفاقاً لشکر اسلام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خواب کی تعبیر کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'اس کو تم نے خلافِ تعبیر کیسے سمجھ لیا، یہ غزوہ اس خواب کی تعبیر کے لیے متعین تو نہیں ہے، شاید اس کا ظہور ابھی باقی ہو۔' پھر دوسری بار دشمنانِ اسلام سے محاربہ ہوا اور لشکر اسلام فتح یاب ہوا اور دشمن کا لشکر شکست و ریخت سے دوچار ہوا۔'

شیخ نے جب یہ بات کہی تو شیخ شمس الدین حیدری کو تسلی ہوئی اور معذرت چاہی کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، اس پر شرمندہ ہوں۔ اس گفتگو کو ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ خواب کی تعبیر ظاہر ہوئی۔ یعنی ان کی بیوی کو استقرار ہوا اور فضلِ الٰہی سے لڑکا پیدا ہوا۔

وحدت آباد لہرا سے غازی پور

۱۱۶۴ھ [۱۷۵۱ء] میں شیخ ابوالغوث گرم دیوان نے لہرا کی سکونت ترک کی اور غازی پور جا کر آباد ہوئے۔ ترکِ سکونت کی اصل وجہ کیا تھی، اس کے بارے میں حتمی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے، شیخ شمس الدین حیدری نے اجمالاً اتنا لکھا ہے کہ چکلہ سدھاری کے ایک عامل نے آستانہ وحدت آباد لہرا کے ایک کسان کو غیر معمولی اذیت دی اور اتنا ستایا کہ شیخ نے ترکِ وطن کا ارادہ کرلیا۔ ممکن ہے کہ اس عامل نے در پردہ شیخ کو بھی اذیت پہنچانے کی کوشش کی ہو اور کسی معاملے میں ان کے خلاف سازش بھی کی ہو، جس کی وجہ سے شیخ دل برداشتہ ہو کر ترکِ وطن پر آمادہ ہوئے ہوں۔

شیخ نے جب ترکِ وطن کا ارادہ کیا تو شدہ شدہ یہ بات دور تک پھیل گئی، غازی پور میں اس وقت نواب فضل علی خان [۱] حاکم تھا، اس کے قریبی لوگوں میں سے کچھ شیخ کے معتقد بھی تھے۔ ان تک جب یہ بات پہنچی تو ان لوگوں نے نواب فضل علی سے اس کا ذکر کیا اور نواب کو اس بات پر آمادہ کیا کہ خط لکھ کر شیخ کو غازی پور آنے کی دعوت دی جائے۔ چناں چہ نواب موصوف نے مکتوب لکھ کر شیخ کو اہل وعیال سمیت غازی پور آنے کی دعوت دی، جس کے جواب میں شیخ نے لکھا کہ 'حقیقت میں میرا ارادہ بیت اللہ جانے کا ہے، مگر میں اپنے متعلقین کو اس دیارِ نا قدراں میں نہیں چھوڑ سکتا، اس لیے ان شاء اللہ جلد ہی آپ کی طرف آنے کا ارادہ کروں گا۔'

غازی پور کی طرف

ایک شام حسبِ معمول چہل قدمی کے لیے جنگل کی طرف نکلے اور محمد آباد کی راہ لی۔

آپ کے ارادے کی اطلاع صرف دو شخصوں کو تھی: ایک شیخ شمس الدین حیدری اور دوسرے شیخ کے بھتیجے شاہ عبدالحق کو۔ پیچھے پیچھے سائے کی طرح شاہ عبدالحق بھی چلے اور پا پیادہ محمد آباد پہنچے۔ محمد آباد میں شیخ ابوالغوث اپنے استاذ سید غلام احمد صاحب کے یہاں فروکش ہوئے۔ رات ہی میں کہاروں کی سواری کا نظم کیا گیا اور رات کے آخری پہر میں محمد آباد سے غازی پور کے لیے نکل گئے۔ لہرااوراس کے اطراف کا جو حاکم تھا، اسے کسی ذریعے سے اطلاع مل گئی تھی کہ رات میں شیخ ترکِ وطن کر کے محمد آباد سے غازی پور جانے والے ہیں، اس نے اپنے لوگوں کو متعین کیا کہ راتوں رات کسی طرح ان کی خدمت میں پہنچ کر انھیں محمد آباد سے جانے سے روکا جائے، مگر ان لوگوں کو محمد آباد پہنچنے میں تاخیر ہوئی اور شیخ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

شیخ جب مئو پہنچے تو نواب غازی پور کا پیغام ملا کہ 'میں ذرا انتظام وانصرام اور جاگیروں کے بندوبست میں مصروف ہوں، اس لیے ابھی پابوسی کی سعادت حاصل کرنے سے قاصر ہوں۔ امید ہے کہ حضرت قاسم آباد میں نزول فرمائیں گے جو اس نیازمند کا وطن ہے۔ وہاں جو جگہ اور جو مکان آپ کو پسند آئے گا، اس میں اقامت کا انتظام کر دیا جائے۔'

اس کے ساتھ ہی نواب موصوف نے خط لکھ کر قاسم آباد میں اپنے کارپردازوں کو بھی تاکید کر دی تھی کہ شیخ کا شان دار استقبال کیا جائے، عمدہ مکان میں ان کی اقامت کا انتظام کیا جائے اور پوری نیازمندی کے ساتھ ان کی خدمت میں سب لوگ حاضر رہیں۔ اور حافظ محمد علی جو نواب موصوف کے استاذ ومصاحب تھے اور قدوۃ العارفین شیخ احمد عبدالحق رودولوی کے خاندان کے تھے، ان کو بہ طور خاص بھیجا کہ وہ شیخ سے کہیں راستے میں مل لیں اور ان کو لے کر قاسم آباد جائیں اور خدمت وضیافت کے سارے انتظامات کر کے واپس میرے پاس آ جائیں۔

حافظ محمد علی نے حسبِ ہدایت شیخ کو قاسم آباد کے باغ کے مکان میں پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اتارا، خدمت کے لیے خدام کو مستعد کیا اور اجازت لے کر واپس نواب موصوف کے پاس چلے گئے۔

شیخ کے افراد خانہ وحدت آباد لہرا ہی میں تھے، شیخ اپنے چند ہم راہیوں کے ساتھ غازی پور پہنچے تھے۔ نواب غازی پور نے اپنے چند قابلِ اعتماد لوگوں کو حکم دیا کہ وہ وحدت آباد لہرا جائیں

اور شیخ کے متعلقین کو اپنے ساتھ لائیں۔ یہ لوگ جب شیخ کے افراد خانہ کو لینے کے لیے غازی پور سے نکلے تو وحدت آباد کے علاقے کے حاکم کو کسی ذریعے سے اطلاع ہوگئی کہ نواب غازی پور کے لوگ شیخ کے افراد خانہ کو لینے کے لیے آرہے ہیں۔ اس نے اپنے بھائیوں میں سے ایک کو متعین کیا کہ وہ نواب غازی پور کے لوگوں سے ملے اور ان کو مطمئن کر کے باز رکھنے کی کوشش کرے، مگر اتفاق ایسا کہ جس دن یہ لوگ وحدت آباد پہنچے، اسی دن حاکم کے ایک بھائی کا انتقال ہوگیا، لوگ اس کی تجہیز و تکفین میں لگ گئے اور روکنے کے لیے وحدت آباد نہیں پہنچ سکے۔

نواب غازی پور جب اطراف کی جاگیروں کے انتظام سے فارغ ہوا تو سب سے پہلے قاسم آباد شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ ملاقات کے بعد واپس لوٹا تو گزراوقات کے لیے پانچ دیہاتوں کی جاگیر کا پروانہ لکھ کر شیخ کی خدمت میں بھیجا۔ پھر شیخ کے حکم پر شہر سے متصل کئی منزلہ پر مشتمل ایک بلند و بالا خانقاہ بنوائی جہاں علما، طلبہ اور اہل سلوک کی جماعت شیخ کے سایۂ عاطفت میں رہتی تھی۔

نواب غازی پور کی مشکل اور شیخ کی حوصلہ افزائی

دورانِ قیام ایک موقع آیا کہ پرگنہ چیت کو پا کے زمین داروں نے نواب غازی پور کی اطاعت سے انکار و انحراف کیا اور بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اطرافِ غازی پور کے تمام زمین داروں نے اس باغی گروہ کا ساتھ دیا اور رفاقت و حمایت کا معاہدہ کر لیا اور ایک بڑی فوج کے ساتھ نواب موصوف سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ نواب موصوف کے تمام ارکانِ دولت نے مشورہ دیا کہ اس جنگ سے بچنے ہی میں بھلائی ہے، کیوں کہ اسبابِ ظاہری کو دیکھتے ہوئے ان کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

غرض یہ کہ ان لوگوں نے نواب موصوف کے دل میں خوف بٹھا دیا، اور ادھر باغیوں نے دیکھا کہ نواب دارالامارت سے باہر نہیں آرہا ہے تو ان کے حوصلے اور بلند ہو گئے اور وہ شورش وفساد پر آمادہ ہو گئے۔ اُن کی حرکتوں پر نواب کا تابِ تحمل جواب دے گیا، وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، باغیوں کی حرکت کی اطلاع دی اور اپنی کامیابی کی درخواست کر کے جواب کے انتظار

میں کھڑا ہو گیا۔ شیخ نے مکاشفہ سے سر اٹھایا اور یہ شعر پڑھا:

براہے بہر منزلے کامیاب
ز نصر من اللہ فتح قریب

نواب موصوف آداب بجالایا اور جنگ کی تیاری کی اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے پہنچ گیا۔ لڑائی ہوئی اور مفسدوں نے شکست کھائی۔

نواب غازی پور پر عتاب اور شیخ کی عنایت

اس واقعے کے چند دنوں کے بعد نواب موصوف کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ یعنی ایک نامناسب حرکت کی وجہ سے اس پر نواب شجاع الدولہ کا عتاب نازل ہو گیا اور ایک سال تک محاسبہ کے لیے اسے نواب شجاع الدولہ کے ساتھ لکھنؤ میں رہنا پڑا۔ اس مدت میں نواب موصوف پابندی سے شیخ کو خط لکھ کر اپنے احوال کی اطلاع دیتا رہا اور اپنی حرکت سے توبہ کرتا رہا۔ ایک روز اچانک شیخ ابوالغوث نے شمس الدین حیدری کو حکم دیا کہ جا کر نواب فضل علی خان کو لے کر آؤ۔ حالاں کہ اس وقت تک نواب موصوف کی رہائی کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شیخ کے حکم کی تعمیل میں وہ لکھنؤ کے لیے نکل پڑے، جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ نواب فضل علی خان کی خلاصی کے سلسلے میں سرے سے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی ہے۔

چند دن کے بعد عید الفطر کی رات اچانک شجاع الدولہ بہادر نے فضل علی خان کو اپنے پاس طلب کیا اور اس کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کیا۔ صبح میں عید کی نماز ادا کرنے کے بعد شجاع الدولہ الٰہ آباد کے لیے نکلا اور فضل علی خان کو بھی اپنے ہم راہ لیتا گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد لکھنؤ واپس لوٹا اور فضل علی خان کو پورے اعزاز کے ساتھ غازی پور روانہ کر دیا۔

نواب غازی پور پر شیخ نے کامل توجہ رکھی اور اس نے بھی نیازمندی میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ہمہ وقت ہر طرح کی خدمت کے لیے مستعد رہتا۔ نواب غازی پور کی خوش قسمتی کے ستارے نے انھیں دنوں کروٹ لی اور چکلہ سدھاری کا والی اپنی بعض عاقبت نااندیشیوں کی وجہ سے زیر عتاب ہو گیا اور اس دیار کو بھی نواب غازی پور کے تصرف میں دے دیا گیا۔ مگر نواب موصوف

اسے زیادہ دنوں تک سنبھال نہیں سکا اور کچھ ہی دنوں کے بعد اپنی بعض ناپسندیدہ حرکتوں کی وجہ سے دونوں جگہوں سے معزول کر دیا گیا۔

اسی درمیان وحدت آباد اور اس کے اطراف کے والی اور اس کے اقربا اور مخلصین نے شیخ سے درخواست کی کہ وطن واپس آ جائیں۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد شیخ نے درخواست قبول کر لی اور ۱۰- رجب ۱۱۷۶ھ [۲۵ مئی ۱۷۶۳ء] کو وحدت آباد دلہرا واپس آ گئے۔

گویا کہ شیخ بارہ سال تارکِ وطن رہے اور غازی پور میں مقیم رہے۔ اس مدت میں وہاں بھی خانقاہ اور مدرسے کی تعمیر ہوگئی اور ہنگامہ ہاؤ ہو اور ضربِ حق کا سلسلہ چل پڑا۔ طلبہ و سالکین کی ایک جماعت اکٹھا ہوگئی اور اس علاقے کی رونق دوبالا ہوگئی۔ مگر جب شیخ وہاں سے وحدت آباد آئے ہیں تو وہاں خریف و خزاں کا موسم شروع ہوگیا اور ربیع و بہار کا موسم پھر وحدت آباد میں خیمہ زن ہوا۔ اطراف و اکناف کے لوگ نشاط و انبساط سے سرشار اور جذبۂ تشکر سے مخمور گویا کہہ رہے ہوں:

شکرِ خدا کہ مظہرِ ذاتِ خدا رسید
مرہم نہ جراحت شاہ و گدا رسید
گم گشتگانِ راہ شب داج را چہ غم
کانوار بخش عالم و بدرالدجی رسید
یعنی کہ بادشاہ ابوالغوث غوثِ دہر
در آشیانۂ شرف و کبریا رسید
بر ساکنان روے زمیں از براے شکر
از ساکنان عالم علوی ندا رسید

حاشیہ

۱- نواب فضل علی خان حاکم غازی پور بڑے عجیب وغریب کردار اور متضاد اوصاف کا مالک تھا۔ بہت بہادر اور نڈر انسان تھا، ساتھ ہی بڑا منتقم المزاج اور شقی القلب تھا۔ جسامت کا حال یہ تھا کہ اپنے

پاؤں کو دیکھ نہیں پاتا تھا۔ اسی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ اسے خیال آیا کہ میں نے لوگوں کو ہر طرح سے مرتے دیکھا ہے مگر کسی کو پانی میں ڈوب کر مرتے نہیں دیکھا۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے انسانوں سے بھری ایک کشتی دریاے گنگا میں غرق کرائی اور اپنے محل کی چھت سے اپنی بیوی کے ساتھ ان بدنصیبوں کے ڈوبنے کا منظر دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ تعنت وسرکشی اس کے خمیر میں شامل تھی، حکام بالا کے احکام کو بھی بسا اوقات خاطر میں نہیں لاتا تھا جس کی وجہ سے کئی مرتبہ معتوب ہوا اور حکومت بھی سلب ہوئی۔ ماتحتوں کے ساتھ بڑی فیاضی کا معاملہ کرتا تھا۔ اصحابِ علم وفضل کا بڑا قدر دان تھا۔ اپنے ماتحت علاقے کے علما کی پوری مدد کرتا اور ان کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کے دور میں اہل تشیع کو زیادہ فروغ ملا، جگہ جگہ امام باڑے بنائے اور عزاداری کو بنیادوں کو مضبوطی فراہم کی۔ [عبیدالرحمان صدیقی، تذکرہ مشائخ غازی پور، انیس پبلی کیشنز، صمد منزل مچھرہٹہ غازی پور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۵، ۱۳۹، ۱۴۵]

تذکرہ مشائخ غازی پور میں نواب فضل علی کا سن وفات ۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۷۳ء [ص ۱۴۹] لکھا ہوا ہے جو کہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ اسی کتاب میں شیخ ابوالغوث کے تذکرے میں ان کے غازی پور پہنچنے کا سن ۱۱۶۷ھ [ص ۴۲۳] لکھا ہے۔ اور یہ طے شدہ ہے کہ شیخ ابوالغوث نواب فضل علی کی زندگی ہی میں غازی پور گئے تھے اور فضل علی نے ان سے ملاقات بھی کی تھی۔ اور پھر ۱۱۵۷ھ کے اعتبار سے سن عیسوی ۱۷۴۴ ہوتا ہے نہ کہ ۱۷۷۳ء۔ ۱۷۷۳ء کے حساب سے سن ہجری ۱۱۸۷ ہوتا ہے۔ کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ فضل علی کا سن وفات ''غلام ال عبا بود'' سے نکلتا ہے، جس کا عدد ۱۱۸۷ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے درست سن وفات ۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۷۳ء ہوگا۔

نواب فضل علی کی موت بڑی عبرت ناک ہوئی، فیض آباد میں انتقال ہوا اور لاش تیرہ مہینے تک بغیر دفن کے پڑی رہی۔ تیرہ مہینے کے بعد اس کی بیوی لاش فیض آباد سے غازی پور لائی اور دفن کیا۔

◆ ◆ ◆

آخری ایام

غازی پور سے واپسی کے بعد دو سال شیخ حیات سے رہے۔عمر کے آخری پڑاؤ میں دیگر چھوٹے موٹے عوارض کے ساتھ بینائی بھی ختم ہوگئی تھی، چلنے پھرنے اور کہیں آنے جانے کے لیے مستقل ایک خادم کی ضرورت پڑتی تھی۔انتقال سے چندروز پہلے بازو میں درد شروع ہوا اور پھر وہ درد آہستہ آہستہ پورے جسم میں پھیل گیا۔کبھی یہ درد اتنا شدید ہوجاتا کہ تابِ سخن بھی ختم ہوجاتی۔

انتقال سے ایک روز پہلے یعنی ۲۵ جمادی الثانیہ کو آپ خلاف معمول اپنے حجرے سے تنہا باہر آئے اور مسجد کے چبوترے پر جا کر بیٹھے۔خدام نے جب دیکھا تو دوڑے آپ کے پاس آئے۔عبداللہ نامی ایک نابینا خادم سے آپ نے فرمایا کہ اس وقت جو بھی تم کو یاد ہو، ترنم سے سناؤ۔اس نے سنانا شروع کیا تو وجد کی کیفیت طاری ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد طبیعت بحال ہوئی تو واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

آخری رات

۲۶ جمادی الثانیہ ۱۱۷۸ھ [۲۱ دسمبر ۱۷۶۴ء] پنج شنبہ کا دن معمول کے مطابق گزرا، رات آئی تو شیخ نے اپنے کمرے کے اسباب یعنی بستر، تکیہ اور جانماز وغیرہ ایک کنارے کروادیا اور استراحت کی چوکی اور تخت پوش بھی باہر رکھوادیا اور پورا کمرا تازہ مٹی سے لیپا گیا۔گویا شیخ کو اپنے رخصت ہونے کا اندازہ ہوگیا تھا جس کی تیاری میں بستر وغیرہ سمٹوا دیا۔شیخ شمس الدین حیدری نے اس رات کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

''۲۶ جمادی الثانیہ پنج شنبہ کا دن گزرنے کے بعد معمول کے مطابق کاتب حروف عشا

کی نماز کے بعد حضرت کے کمرے میں گیا اور پابوسی کی سعادت حاصل کی۔ حضرت کے کمرے میں بستر اور تکیہ کو خلاف دستور اپنی جگہ سے ہٹا دیکھ کر ایک عجیب طرح کا خوف طاری ہو گیا۔ ہمیشہ استراحت کی چوکی پر تکیہ شمال کی طرف رکھا رہتا تھا اور چوکی کے سامنے مغرب کی سمت میں ایک تخت پوش نماز کے لیے بچھا رہتا تھا۔ آج میں نے دیکھا کہ پورا کمرہ تازہ مٹی سے لیپا گیا ہے اور چوکی و تخت پوش باہر رکھا ہے، ایک ہلکی اور چھوٹی سی چوکی مشرق کی طرف بچھی ہوئی ہے اور بستر و تکیہ وغیرہ لپیٹ کر رکھا ہوا ہے، حضرت شمال و مغرب کے گوشے میں بیٹھے ہیں اور مخدوم زادہ ولا گہر عبدالکریم کھڑے ہو کر آپ کے بائیں بازو پر مونڈھے کے قریب مالش کر رہے ہیں۔ جب میں کمرے کے اندر داخل ہوا تو انھوں نے میرا نام لے کر حضرت کو میرے آنے کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا کہ ' آؤ! اس وقت بات کرنے میں تکلیف محسوس ہو رہی ہے، شدید درد کا احساس ہو رہا ہے۔' پھر تھوڑی دیر کے بعد درد میں افاقہ ہو گیا اور آپ معمول کے مطابق بات کرنے لگے۔ دیر تک آپ پوری بشاشت کے ساتھ بیٹھے رہے، یہاں تک کہ آدھی رات گزر گئی۔ چوں کہ فقرا اور طلبہ کے درمیان کھانا تقسیم کرانا کاتب حروف کے ذمہ داری تھی، اس لیے میں رخصت لے کر چلا آیا، مخدوم زادہ والا گہر عبدالکریم کو آپ نے عشا کی نماز پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔

ابھی کھانا تقسیم کر کے میں بستر پر لیٹا ہی تھا کہ حضرت کی چھوٹی خادمہ جو آپ کے کمرے کے صحن میں تھی، اس نے تین بار کمرے سے 'اللہ اللہ اللہ' کی آواز سنی اور دوڑتی ہوئی آ کر اطلاع دی کہ حضرت محبوبِ حقیقی کے پاس چلے گئے۔ یہ خبر حضرت کے گھر میں جیسے ہی پہنچی، بیٹے اور خادم فوراً باہر آئے۔'' [مناقب غوثی قلمی، ص ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵]

تکفین وتدفین

تکفین وتدفین کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شیخ شمس الدین حیدری نے لکھا ہے:

''چوں کہ کفن کے لیے رات میں کپڑا فراہم نہیں ہو سکا تھا، اس لیے رات میں تدفین کی صورت نہیں بن پائی۔ جمعہ کے روز لوگوں کے تعاون سے کفن کا دو کپڑا قیمتاً لایا گیا، کاٹتے وقت دونوں کپڑوں کو الگ الگ رکھا گیا، تا کہ جو عمدہ ہو، اسے استعمال کیا جائے۔ اسی درمیان آپ کے

ایک مرید جواس وقت وہاں موجود تھے، انھوں نے کہا کہ میرے گھر عمدہ قسم کا کپڑا موجود ہے، وہ میں نذر کرتا ہوں۔ جب وہ کپڑا لے کر آئے تو واقعتا بہت نفیس اور عمدہ کپڑا تھا۔اسی ہدیہ کے کپڑے کو کاٹ کر کفن میں استعمال کیا گیا۔

حضرت کی پرانی عادت تھی کہ دیہات کی زمینوں کے محصول کو [جو ان کے آبا و اجداد کی ملکیت تھی] کبھی اپنے کھانے اور کپڑے میں استعمال نہیں کیا، جو بہ طور نذر اور ہدیے کے مل جاتا، اسی سے گزر اوقات کرتے۔ اللہ تعالی نے وفات کے بعد بھی حضرت کی اسی قدیم عادت کو برقرار رکھا۔

صحنِ مسجد سے شمال کی جانب باغ میں کھیری کے درخت کے نیچے آپ کو دفن کیا گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

کاتبِ حروف [شیخ شمس الدین حیدری] نے آپ کی تاریخ وفات نظم کی ہے، اخیر کے مصرع سے سن وفات نکلتا ہے:

ست عشرین از جماد اخیر
نیم شب از آدینہ شو آگاہ
گفت ہاتف بگوش اہل سخن
گشتہ محبوب حق فنا فی اللہ

ایضاً

شاہ ابوالغوث آں گرامی شاہ
بود در وقت خویش ظل اللہ
شرح احوال او نمی گنجد
اندریں صفحہ کآمدہ کوتاہ
مصرع آخریں ز تاریخش
بر کمالات حال او ست گواہ

اولاد وخلفا

بیٹی

نام اور دیگر تفصیلات معلوم نہیں ہوسکی۔ صاحبِ مناقب غوثی کے اجمالی ذکر سے اتنا معلوم ہوسکا کہ یہ بچی شیخ کی شادی کے ایک سال بعد پیدا ہوئی۔ یعنی ۱۱۲۴ھ [۱۷۱۲ء] میں۔ بڑی ہوکر شیخ ابوالغوث کے ہم شیر زادہ شیخ عبدالحکیم خان صدیقی سے منسوب ہوئی اور صاحبِ اولاد ہوئی۔[۱]

علی اکبر [بیٹے]

ربیع الثانی ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء میں شیخ کے دوسرے بچے علی اکبر کی ولادت ہوئی۔ اس بچے کی ولادت کے موقع پر ایک خاص واقعہ یہ پیش آیا کہ پسر نومولود کی خبر سن کر کسی خادم نے جا کر شیخ کو مبارک باد دے دی۔ یہ اس زمانے کے رواج کے عین مطابق تھا، مگر شیخ ابوالغوث کو چوں کہ رواج و رسومات سے سخت تنفر تھا، اس لیے مبارک باد پر ان کی طبیعت سخت مکدر ہوئی اور یہ تکدر کئی روز تک باقی رہا۔[۲]

اس بچے کی ولادت کے چند دنوں کے بعد شیخ کی اہلیہ محترمہ نے وفات پائی۔ اور اس کے چند روز کے بعد نومولود صاحب زادے علی اکبر نے بھی رجب ۱۱۲۵ھ/ جون ۱۷۱۳ء داغِ مفارقت دی۔[۳]

شیخ کی یہ دونوں اولاد پہلی اہلیہ یعنی فاطمہ بنت منور خان صدیقی [سپاہ] کے بطن سے تھیں۔

حافظ شاہ ابواسحاق محدث [بیٹے وخلیفہ]

شیخ ابواسحاق ابن شیخ ابوالغوث گرم دیوان جید عالم اور بلند مرتبہ محدث تھے، تصوف و سلوک میں بھی انھیں ید طولی حاصل تھا۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کا مختصر مگر بلند الفاظ میں ذکر کیا ہے:

الشیخ العالم المحدث ابواسحاق بن ابی الغوث العمری البھیروی احد العلماء الراسخین فی العلم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وکان آیة ظاہرة و نعمة باہرة فی التقوی والعزیمة و قلة الامل، و کانت له ید بیضاء فی نقد الاحادیث و تصحیحہا، اخذ عنه خلق کثیر۔ [۴]

شیخ ،عالم، محدث ابواسحاق بن ابوالغوث فاروقی بھیروی علماے راسخین میں سے تھے۔ وہ تقوی، عزیمت اور قناعت میں بے نظیر تھے، احادیث کے نقد و تصحیح میں انھیں ملکہ حاصل تھا، خلق کثیر نے ان سے اکتساب علم کیا۔

شیخ ابواسحاق نے حفظ قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ ابوالغوث سے حاصل کی، مزید حصول علم کے لیے الہ آباد کا سفر کیا اور وہاں مولانا فاخر صاحب [۵] سے علم حدیث اور دیگر علوم وفنون حاصل کیے۔ الہ آباد سے فراغت کے بعد لہرا آئے، اپنے والد شیخ ابوالغوث سے سلسلۂ بیعت استوار کیا اور خلافت واجازت حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے۔

شیخ ابواسحاق پر فقہی مسائل میں اپنے استاذ مولانا فاخر صاحب کا اثر زیادہ تھا۔ مولانا فاخر صاحب تقلید کی بجاے اجتہاد پر عمل پیرا تھے، یہی رنگ شاگرد پر بھی غالب آیا اور انھوں نے بھی کتاب وسنت سے براہ راست اخذ واستفادہ کی راہ اختیار کی۔ احادیث کے نقد و تصحیح میں شیخ ابواسحاق کو بے نظیر ملکہ حاصل تھا، بخاری شریف سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔

شیخ ابواسحاق علم وعمل کے جامع نادرۂ روزگار عالم تھے، زہد وتقوی بے مثال تھا، کتاب و سنت کا بے حد اہتمام تھا، سنت رسول کے انتہائی پابند تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں وہ کسی کی تمیز نہیں کرتے تھے۔ پوری زندگی تعلیم وتلقین میں بسر کی۔

والد شیخ ابوالغوث کی وفات کے بعد غازی پور چلے گئے تھے۔ ۱۲۳۴ھ [۱۸۱۹ء] میں غازی پور میں انتقال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔ [۵]

شاہ عبدالعلیم [بیٹے]

حافظ شاہ عبدالعلیم صاحب شیخ ابوالغوث کے صاحب زادے تھے، حافظ قرآن تھے اور یہ غالباً شاہ ابواسحاق صاحب سے عمر میں چھوٹے تھے۔ شیخ ابوالغوث کے انتقال کے بعد دونوں بھائی موضع دھاوا ضلع غازی پور آ گئے اور اپنے والد کی خانقاہ و درس گاہ آباد کی۔ حافظ عبدالعلیم صاحب خانقاہ کے سجادہ نشین بنے، مگر زیادہ مدت غازی پور میں نہیں رہے، واپس بھیرا آ گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور بھیرا ہی میں انتقال ہوا۔

حافظ شاہ عبدالعلیم کے بیٹے شاہ باسط علی بھیرا کی سکونت ترک کر کے واپس دھاوا غازی پور چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور دھاوا ہی میں وفات بھی پائی۔ [۶]

قطب الدین [بیٹے]

قطب الدین دوسری اہلیہ کے بطن سے تھے، ان کی پیدائش لہرا میں ہوئی تھی اور صغر سنی ہی میں وفات پائی۔ ان کی وفات ۱۶ رجب ۱۱۳۷ھ [۳۱ مارچ ۱۷۲۵ء] کو ہوئی۔ ان کی وفات کے وقت شیخ ابوالغوث پورے سال کے اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مرض الوفات میں دوران علاج و معالجہ گھر کی عورتوں نے بہت کوشش کی کہ شیخ حجرۂ اعتکاف سے نکل کر اپنے بیٹے کی حالت دیکھ لیں اور کچھ دعا وغیرہ کر دیں، مگر شیخ نے اعتکاف توڑنا گوارا نہیں کیا۔ [۷]

شیخ عبدالکریم [بیٹے]

ان کا ذکر شیخ شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں شیخ کی آخری رات کا نقشہ کھینچتے ہوئے ضمناً دو مرتبہ کیا ہے اور دونوں جگہ ''مخدوم زادہ والا گھر'' [۸] کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مخدوم زادہ کے لفظ سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ بھی شیخ کے بیٹے تھے اور بعض اشاروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ

شیخ کی وفات کے وقت یہ عمر کی دو دہائی عبور کر چکے تھے۔

شاہ معشوق علی غازی پوری [خلیفہ وجانشین]

شاہ معشوق علی مہتور آباد ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے۔ صاحب تذکرہ علماے ہند نے شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے نام ور خلفا میں ان کا نام شمار کرایا ہے۔ شیخ ابوالغوث ان پر بے حد شفقت فرماتے اور ان پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ وفات سے پہلے ان کو اپنا جانشین بنا دیا تھا، حالاں کہ ان کے لائق فائق صاحب زادے شاہ ابواسحاق بھی ان کے خلیفہ تھے اور جانشینی کی پوری لیاقت رکھتے تھے، ساتھ میں حافظ و قاری اور محدث بھی تھے، مگر اس کے باوصف شیخ ابوالغوث نے شاہ معشوق علی کو ترجیح دی۔ اس سے شیخ کی نگاہ میں شاہ معشوق علی کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

شیخ ابوالغوث کی وفات کے بعد بعض اعزا نے ان کی جانشینی کو ناپسند کیا اور مشورہ کیا کہ ان کو ہٹا کر شاہ ابواسحاق کو بٹھایا جائے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہٹائے کون؟ اس کام کے لیے شیخ ابوالغوث کے دوسرے خلیفہ شیخ روح الامین چریاکوٹی تیار ہوئے اور حجرۂ خاص میں پہنچ کر ان کا ہاتھ پکڑ یہ کہتے ہوئے اٹھا دیا کہ یہ شاہ ابواسحاق کی جگہ ہے، اس پر انھیں کا حق ہے۔[۹]

شیخ شمس الدین حیدری بھادوں [خلیفہ وسوانح نویس]

شیخ شمس الدین حیدری ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بھادوں کے رہنے والے تھے۔ صغر سنی ہی سے شیخ ابوالغوث کے والہ وشیدا اور معتقد تھے اور ان کی تربیت کے سائے میں رہے۔ شیخ حیدری نے اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''امابعد! چنیں گوید فقیر حقیر بندہ پرتقصیر طالب ارشاد و رہبری شمس الدین حیدری کہ قایل ایں مقالہ و جامع ایں رسالہ است کہ چوں ایام صغرسن بانواع تلطفات جناب ولایت مآب مظہر انوار احدیت، مہبط آثار فردیت، مبرا از شوائب ولوث، قطب افراد حضرت ابوالغوث مد اللہ ظلال افضالہ تربیت و پرورش یافتم وشکر ایں نعمت را کہ حدے ونہایتے ندارد بکدام زبان ادا

نمایم:[۱۰]

شکر فیض تو چوں کند اے ابر بہار
کہ اگر خار و گر گل ہمہ پروردہ تست

فقیر حقیر بندہ پُرتقصیر، طالب ارشاد ورہبری شمس الدین حیدری اس مقالہ کا کاتب اور اس رسالہ کا جامع، عرض کرتا ہے کہ جناب ولایت مآب، مظہر انوار احدیت، مہبط آثار فردیت، مبرا از شوائب ولوث، قطب افراد حضرت ابوالغوث مداللہ ظلال افضالہ کے طرح طرح کے تلطفات کے سائے میں صغرسن میں تربیت و پرورش پایا ہوں، اور اس بے حد وحساب نعمت کا شکر میں کس زبان سے ادا کروں:

شکر فیض تو چوں کند اے ابر بہار
کہ اگر خار و گر گل ہمہ پروردہ تست

شیخ شمس الدین حیدری نے تصوف وسلوک کی ابتدا حضرت شیخ غلام احمد چراغ ہندی بن حضرت شاہ ابوالفتح کے دست مبارک پر بیعت کر کے کی ہے، جس کا ذکر اجمالاً واشارتاً مناقبِ غوثی کے مقدمے میں شیخ حیدری نے کیا ہے۔ حضرت شیخ غلام احمد چراغ ہندی اپنے والد حضرت شاہ ابوالفتح کے خلیفہ وجانشین تھے۔ ان کا آستانہ ظفر آباد ضلع جون پور میں واقع ہے۔

شیخ حیدری نے مناقب غوثی کے چوتھے باب میں شیخ ابوالغوث گرم دیوان اور اپنے تعلقات کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس باب میں بہت اہتمام سے انھوں نے عبارت آرائی کی ہے اور حتی الوسع اس باب کو فخیم وعسیر الفاظ اور مقفا ومسجع جملوں سے آراستہ کیا ہے۔ اس باب کا عنوان ہے: داخل شدنِ کاتب حروف در سلک منتسبان آستان فیض نشان و بذلِ تلطفات آں محبوب الرحمان بر حالِ ایں طالبِ صادق۔ اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بجاے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کے اہم اور ضروری مقامات کا ترجمہ پیش کر دیا جائے۔

شیخ حیدری پیرومرشد کی خدمت میں حاضری کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کاتب حروف اخلاص کے جذبے سے لبریز جناب ولایت مآب کی قدم بوسی کا پختہ عزم کر کے آمادۂ سفر ہوا اور فراواں جذبۂ شوق کے ساتھ منزلِ مقصود یعنی محبوبِ الٰہی کی بارگاہ تک

پہنچا۔ایسی فرحت افزااور دل کشا جگہ تھی کہ علیین کی یاد تازہ ہوگئی۔ جب اس جگہ پہنچا تو میں نے وہ دیکھا جو کبھی سنا نہیں تھا اور وہ سنا جو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ میں نے ہر طرف نگاہ دوڑائی، بساطِ اخلاص پر مجھے یک رنگی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔

جب دروازے پر میں پہنچا تو گویا کہ اپنی خوش بختی کا دروازہ کھلتا ہوا محسوس کیا۔ دروازہ کیا تھا گویا کسی سخی انسان کا دل تھا جس میں ہر شخص کے لیے گنجایش ہوتی ہے۔ جاروب کش دل جمعی کے ساتھ دروازے کے سامنے جھاڑو دے رہا تھا۔ میں نے دروازے کے سامنے جبینِ اخلاص کو جھکا کر اپنی پیشانی کو منور کیا۔ آستانۂ فیض نشان کے سکونت پذیر چند حضرات دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے اور پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ مجھے ایک فرحت بخش جگہ بٹھایا اور جو کچھ موجود تھا بہ طور مہمان نوازی میرے سامنے لا کر رکھا۔ جب دلِ آشفتہ کو تسکین کی کیفیت نصیب ہوئی تو دل و دماغ ہر طرف سے یکسو ہو کر ملاقات کی گھڑی کا انتظار کرنے لگا، یہاں تک کہ والیِ ولایتِ اولیا، وارثِ انبیا، ناصبِ اعلامِ شریعت حضرت مرشد حقیقی زاد اللہ تعالی درجاتہ مع البرکات صحنِ خانہ میں تشریف لائے۔ جب حضرت مرشد حقیقی کی تشریف آوری کی خبر کاتبِ حروف کو ملی تو میں محض زیارت کے تصور ہی سے از خود رفتہ ہو گیا اور مدہوشی کے عالم میں پابوسی کے لیے دوڑ پڑا۔ نعلین مبارک کو جو کہ واصلین کے لیے محراب کے مثل ہے، ادب کے ہونٹوں سے چوما، ارادت کی آنکھوں سے اس کے غبار کو جھاڑ کر آنکھ کا سرمہ بنایا۔ جب حضرت کے جمالِ با کمال کی زیارت ہوئی تو گویا ایسا محسوس ہوا کہ میں نورِ مطلق کو دیکھ رہا ہوں جو جسد عنصری کے پردے میں متمثل ہو گیا ہے۔ میں نے ظہورِ برحق کو ایسے بشر کے لباس میں پایا جو' اذا تم الفقر فهو الله ' کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ پاک بازی کی پرواز میں' اذ یتقرب الیّ بالنوافل ' کے بلند منصب سے سرفراز تھا، جس کی روشن پیشانی سے انوارِ صمدیت کی شعائیں پھوٹ رہی تھیں اور جس کے چہرے سے اسرارِ احدیت کی شعائیں مترشح تھیں۔

حضرت کے جمال با کمال کے مشاہدے میں میں ایسا محو و مستغرق ہو گیا کہ غایتِ استغراق کی وجہ سے خیالات و معانی کی ڈور ہاتھ سے چھوٹ گئی اور زبان پر بے ساختہ یہ شعر آ گیا:

اے نورِ خدا! در نظر از روے تو ما را
بگذار کہ در روے تو بینم خدا را

حاصلِ کلام یہ کہ جب میں درگاہ کے خادموں میں شامل ہو گیا تو باادب پورے آستانے کو گھوم پھر کر دیکھا اور چند دن حضرت مرشد حقیقی کی جوتی سیدھی کی۔ حسنِ اعتقاد کی برکت سے حضرت میرے احوال کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک رات کاتبِ حروف کو خلوتِ خاص میں یاد فرمایا۔ جب میں پہنچا تو میرے مذاق اور سطح کے مطابق لطائفِ صوفیہ کے رمز و اشارات ارشاد فرمائے اور نصیحتیں کیں۔ سلوک کی باریک باتیں اس قدر مدلل و واضح بیان کیں کہ اس ضعیف کو شرحِ صدر کی کیفیت حاصل ہو گئی۔ اثنائے گفتگو اپنی خاص عنایت سے بہت سے تشنۂ جواب سوالات کی ایسی گرہ کشائی کی کہ اسرارِ حق کی کیفیت سے میں مدہوش سا ہو کر سر قدمِ مبارک پر رکھ دیا۔

بہر کیف! جب میں نے بہت سے دینی و یقینی فوائد حاصل کر لیے تو بعض دنیوی ضرورتوں کی وجہ سے وطن لوٹنے کی اجازت چاہی اور حضرت نے اجازت دے دی۔

بہر حال سال میں دو تین مرتبہ آستانۂ فیض آثار پر حاضر ہوتا اور وہاں چند دن قیام کر کے کلفت کے زنگ سے اپنے آئینۂ قلب کو صیقل کرتا اور ہر حاضری میں حضرت کی دوگنی نوازشوں سے فیض یاب ہوتا۔

جب میں حضرت کے آستانے پر پہنچا تھا تو اس وقت نظم کہنے یا نثر لکھنے کی استعداد میرے اندر نہیں تھی، بس کبھی کبھار جوشِ طبعی کی بنیاد پر کچھ تک بندی کر لیتا تھا۔ ایک دن سادات کرام کی مدح میں ایک غزل لکھی اور حضرت کو دکھلائی۔ حضرت نے حوصلہ افزائی کے لیے اس مدحیہ غزل کو ایک دن مجلس میں پڑھ دیا، مجلس میں موجود ایک شخص نے اس غزل پر حرف گیری کر دی، حضرت کو اس کی حرف گیری پسند نہیں آئی اور حضرت نے اس کے جواب میں تحسین و آفریں کے کلمات کہے۔ اس دن سے کاتبِ حروف جس کے اندر نظم و نثر کی لیاقت نہیں تھی، حضرت کے کرشمۂ توجہ سے اپنے مافی الضمیر کو صفحۂ قرطاس پر رقم کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن حضرت مرشد حقیقی نے اپنی زبانِ مبارک سے میری تسلیِ خاطر کے لیے چند

کلمات کہے۔ میں نے شرائط تعظیم کوملحوظ رکھتے ہوئے فی البدیہ مدحیہ اشعار آپ کی خدمت میں پیش کیے:

به هر طرف که نگه می کنم دریں عالم
ترا ذات عدیم المثال می یابم
محبتِ تو کلیدِ درِ سعادتہا ست
به دل ز صدق و یقین ایں خیال می یابم
دلم چگونه کند حصر مدح شایانت
زبانِ ناطقه در شرح لال می یابم
کجا بمدح تو یک رو شوم که ذات ترا
به شرق و غرب و جنوب و شمال می یابم
نه زاد مثل تو فرزند مادرِ ایام
بحسن خلق ترا بے مثال می یابم
چو حیدری بدرت سائل آمدم از صدق
امید ہست جزاے سوال می یابم

حضرت کی نوازش اس ذرۂ بے مقدار پر اتنی تھی کہ ایک روز رخصت کے وقت یہ شعر آپ نے پڑھا:

می روی بافتح و در فتراک تو غوثی مدام
دائما حق حافظ و ناصر تو باد والسلام[۱۱]

شیخ حیدری صرف آستانے کے خادم یا شیخ کے مرید ہی نہیں تھے بلکہ شیخ کے معتمدِ خاص تھے، گھریلو معاملات اور انتظامات میں بھی شیخ نے انھیں دخیل کر رکھا تھا۔ ۱۱۳۶ھ [۱۷۲۴ء] میں جب شیخ ایک سال کے اعتکاف کی نیت سے معتکف ہوئے تو اس موقع سے اپنے گھر کے سارے انتظامات انھوں نے شیخ حیدری ہی کے حوالے کیے تھے۔ اسی طرح جب کوئی نازک

موقع آتا تو شیخ حیدری کو اپنا راز دار بھی بناتے۔ چکلہ سدھاری کے حاکم نے وحدت آباد لہرا کے ایک کسان پر جب ظلم کیا اور معاملے نے طول پکڑا تو شیخ نے دل برداشتہ ہو کر بیت اللہ ہجرت کرنے کا ارادہ کیا، مگر پھر بعد میں نواب غازی پور کی دعوت پر غازی پور گئے اور بہ وجوہ بیت اللہ نہیں جا سکے۔ ہجرت کے اپنے اس ارادے کا ذکر شیخ نے صرف دو لوگوں سے کیا تھا: ایک اپنے بھتیجے اور خلیفہ شیخ عبدالحق سے اور دوسرے شیخ شمس الدین حیدری سے۔

شیخ حیدری کو بھی اپنے مرشد سے بے حد محبت وعقیدت تھی، بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی عقیدت کے ڈانڈے غلو سے ملے ہوئے تھے۔ ۱۱۴۴ھ [۱۷۳۱ء] میں انھوں نے اپنے مرشد کی سوانح مناقبِ غوثی کے نام سے شروع کی اور آٹھ ابواب میں مکمل کیا۔ شیخ کی وفات کے بعد غازی پور جانے کے واقعے اور وفات سے متعلق معلومات کو بہ طور ضمیمہ شامل کیا۔ یہ کتاب حسنِ عقیدت وغلو کی شاہ کار ہے۔ ہر جگہ اور ہر معاملے میں شیخ کی کرامت اور ان کی ولایت کو آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حتی کہ شیخ ابوالغوث کے شیخ حضرت راجی خیر اللہ اور حضرت راجی دانی کا ذکر کرتے لکھ گئے ہیں:

''در فرقۂ اہل اللہ نظیر ایشاں نبود، اہلِ درجات وصاحبِ مقامات عالی بودہ اند، کمالاتِ ایشاں ہمیں بسند است کہ مثل حضرت مرشد حقیقی خلیفہ وجانشین داشتند۔'' [۱۲]

اہل اللہ میں ان دونوں حضرات کی نظیر نہیں ہے، دونوں حضرات بلند درجات اور عالی مقامات کے حامل ہیں، ان کے کمالات کے لیے یہی سند کافی ہے کہ حضرت مرشد حقیقی جیسا انسان ان کا خلیفہ وجانشین ہے۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کو شیخ حیدری نے پوری کتاب میں ہر جگہ مرشد حقیقی کے لقب سے یاد کیا ہے اور کہیں کہیں تو القاب کی اس قدر کثرت ہو گئی ہے کہ بس پوچھیے مت۔ ایسے مقامات کتاب میں متعدد ہیں اور ہر جگہ پانچ سطر سے زائد القاب میں صرف ہوئی ہے۔

شیخ نور محمد کامیاب سبر حدی [خلیفہ]

شیخ نور محمد کامیاب سبر حد ضلع جون پور کے رہنے والے تھے، صاحبِ مناقب غوثی شیخ

شمس الدین حیدری کے داماد تھے۔ شیخ شمس الدین حیدری کی صرف ایک ہی اولاد یعنی بیٹی تھی۔ ایک فرزند کی ولادت ہوئی تھی مگر وہ بچپن ہی میں انتقال کر گیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے یعنی اپنے خسر کی تالیفِ قلب اور ان کے گھر کو ویرانی سے بچانے کے لیے شیخ نور محمد نے سرحد کی سکونت ترک کر دی اور سسرال یعنی بھادوں میں سکونت اختیار کر لی۔ صاحبِ نسبت اور صاحبِ کمال انسان تھے۔ شیخ ابوالغوث گرم دیوان سے اکتسابِ فیض کیا تھا اور انھیں سے خلافت واجازت حاصل تھی۔ بھادوں ہی میں مدفون ہیں۔ آبادی سے متصل سڑک سے ذرا ہٹ کر ان کا ٹوٹا ہوا مزار آج بھی موجود ہے۔ مزار کے کھنڈر سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ خاصا آباد رہا ہوگا، مگر اب کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

شیخ شمس الدین حیدری کے آثار کی تلاش میں راقم الحروف ایک مرتبہ بھادوں گیا تھا، وہاں کے لوگ شیخ نور محمد کامیاب کے نام سے تو واقف ہیں اور اس واقفیت کی وجہ شاید ان کا ٹوٹا ہوا مزار ہے، جواب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے، مگر شیخ شمس الدین حیدری سے واقف نہیں ہیں۔ شیخ نور محمد کے اہل خاندان کے نام پر جن لوگوں سے ہمیں ملایا گیا، وہ بھی شیخ حیدری کے نام سے ناواقف نکلے۔

شیخ نور محمد کامیاب فارسی کے بہترین انشا پرداز و ادیب تھے، مسجع ومقفا عبارتیں لکھتے تھے۔ شیخ شمس الدین حیدری نے مناقبِ غوثی کی تالیف کے بعد اس کی تہذیب وتنقیح انھیں سے کرائی۔ دورانِ تہذیب انھوں نے جگہ جگہ موقع کی مناسبت سے فوائد ووضاحت بھی تحریر کی ہے۔ بعض فوائد بے حد علمی ومعلوماتی ہیں۔ تصوف سے متعلق جو فوائد ہیں وہ اربابِ معانی کے اقوال و احوال کا نچوڑ ہیں۔ کتاب کے شروع میں ایک صفحے کا ابتدائیہ بھی شیخ نور محمد کے قلم سے ہے، جس میں خاص طور سے کتاب کی تصحیح ونظر ثانی اور تحریر فوائد کا ذکر ہے۔

عمدہ نثر نویس ہونے کے ساتھ وہ فارسی و ہندی کے بہترین اور کامیاب شاعر تھے۔ فارسی میں کامیاب تخلص رکھتے تھے۔ چوں کہ فطرتاً صوفی تھے، اس لیے ان کے کلام پر تصوف کا اثر زیادہ ہے۔ مناقبِ غوثی میں ایک جگہ وضاحت کے تحت انھوں نے اپنا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ یہ قصیدہ شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی نذر ہے۔

قصیدہ

روزے آئینہ و شانہ پیش جاناں　　گفتگو واقع شد عقل بماند حیران
ہر یک از فخر سر افراختہ تا اوج فلک　　ہر دو را در ہنر خویش دلیل و برہان
شانہ گفتا کہ بہر سروکارے دارم　　جاے دارم ز بزرگی بسر محبوباں
صد زبانست مرا لیک بمانم خاموش　　پردہ پوشی ست مرا شیوہ بایں چند زباں
باطن تست سیہ باعدام الست نطق　　می کشائی ز رہ خبث عیوب انساں
پاے چوبین ست مرا لیک بتار ہر مو　　می دوم شاطری من مگزائی تیرہ رواں
تاجر چین منم مشک تتارم باز است　　شدہ محتاج بمن ہر یکے از پیر و جواں
رستم اسکندر دوراں کہ بسیر ظلمات　　میل دارم ز پئے جستنِ آبِ حیواں
چوں شنید آئینہ ز شانہ چنیں لاف زنی　　گفت خاموش چہ می لافی تو اے گندہ دہاں
چوب خشکے و بریدہ سر و پاے تو بود　　ہمیہ سوختنی لاف مزن اے ناداں
تیشہ و آرہ کہ از جنس من اند اخر تو　　تربیت یافتہ اندریں عالم ز ایشاں
درمیان من و تو ہست تفاوت بسیار　　روز روشن منم و تو شب تاریک رواں
در پسِ سر کہ ترا آدمی انداختہ اند　　موجبش ایں کہ بکام تو درازست زباں
منم آں صبح جبیں ماہ لقا دست بدست　　می برندم ز تمنا و ہوس ماہ رخاں
خانہ بر دوش مجرد روشم در دنیا　　روشن ست نام سکندر ز من اندر و وراں
نازش و فخر من ایں بس بود اندر عالم　　کہ در افتاد بمن عکس رخ قطب زماں
شاہ ابوالغوث کہ از ابر کف بخشش او　　شد تونگر بزر و لعل و گہر بحر و کاں
مفخرہ عالمیاں قدوہ اہل اسلام　　منبع فضل و کرم معدن فیض و احساں
تا کہ شد گرم رو اندر رہِ عرفانِ خدا　　گرم دایوانش بگویند ہمہ خلق جہاں
خاک درگاہ شریفش کہ بود عرش بریں　　سرمہ دیدہ بینائے اہل عرفاں
تا کہ گشتم شرف اندوز ز مدحت گریش　　شدہ مفتوح برویم در صد گنج نہاں

مدح او نور محمد نتواند گفتن ہست افزوں و بروں از حد تقریر و بیاں
کم مباد از سر خلق جہاں سایہ او بطفیل نبی و حرمت شیر یزداں

شیخ نور محمد کامیاب صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ ان کی بیشتر تصنیفات ہندی میں ہیں۔ چوں کہ ان کے زمانے میں عوامی رابطے کی زبان ہندی ہی تھی، فارسی علمی زبان سمجھی جاتی تھی جس کا حلقہ ہندی کے مقابلے میں محدود تھا، اس لیے اپنے جذبات کا اظہار زیادہ تر انھوں نے ہندی ہی میں کیا۔ ان کی تین تصانیف کے نام ملتے ہیں: [۱] اندراوتی [۲] نل ودمن [۳] انوراگ باسری۔ ان کے ہندی کلام کے دو نمونے ملاحظہ ہوں:

جہاں حسنین بتول سینہا تہاں سمائی نہ دوسر دیہا
جہاں علی حیدر ہے اسد اللہ وہاں کہاں راچھس پاوے راہ

دین آپ جگ سرجن ہارا جن آکاش بن کھمب سنوارا

شیخ نور محمد کا انتقال ۱۷۸۰ء [۱۱۹۵ھ] میں ہوا۔ [۱۳]

شیخ روح الامین عباسی چریاکوٹی [خلیفہ و بھانجے]

شیخ روح الامین چریاکوٹ کے رہنے والے تھے، حضرت مخدوم شاہ اسماعیل چریاکوٹی کی اولاد میں سے تھے۔ صاحبِ نسبت اور صوری و معنوی کمالات کے جامع تھے۔ شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے بھانجے تھے اور غازی پور کے قیام میں مستقل شیخ ابوالغوث کے ساتھ رہے۔ شیخ ابوالغوث سے انھیں خلافت و اجازتِ بیعت بھی حاصل تھی۔

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے تعلق سے شیخ روح الامین کے ایک واقعے کا ذکر صاحبِ مناقب غوثی نے کیا ہے کہ شیخ روح الامین کا بیان ہے کہ مجھ کو ایک روز خواب میں اپنے جد محترم حضرت مخدوم شاہ اسماعیل کی روحانیت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ ہر ولی پر کسی نبی کی ولایت ہوتی ہے، ہمارے شیخ ابوالغوث گرم دیوان پر کس نبی کی ولایت ہے؟ فرمایا کہ شیخ ابوالغوث کو ولایتِ ابراہیمی حاصل ہے۔ اس خواب کی صداقت پر مجھے یقین ہے،

کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تواضعِ حنیف پر مامور تھے اور ہمارے حضرت بھی اسی خدمت پر مامور ہیں۔[۱۴]

شیخ روح الامین کے پیر بھائی تھے شاہ معشوق علی جن پر شیخ ابوالغوث گرم دیوان بہت شفقت فرماتے تھے اور اپنی جانشینی کے لیے تحریری طور پر انھوں کو منتخب کیا تھا۔ شیخ ابوالغوث کے انتقال کے بعد وہ حسبِ انتخاب شیخ کے جانشیں ہوئے، مگر شیخ ابوالغوث کے کچھ قریبی لوگوں کو یہ چیز پسند نہیں آئی۔ ان لوگوں نے باہمی مشورہ سے طے کیا کہ شیخ کی جانشینی کے لیے شیخ کے صاحب زادے حافظ ابواسحاق کے سوا کوئی موزوں نہیں ہے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ شیخ معشوق علی کو اس جگہ سے کون ہٹائے؟ شیخ روح الامین نے یہ کام اپنے ذمے لیا اور حجرے میں گئے، شیخ معشوق علی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور کہا کہ یہ جگہ شیخ ابواسحاق کی ہے، آپ کا یہاں کوئی کام نہیں۔ شیخ معشوق علی بددعا کرتے ہوئے کمرے سے نکلے کہ جس نے مجھے پیر کے قرب سے محروم کیا وہ خانماں برباد ہوجائے۔ اس بددعا کا یہ اثر ہوا کہ چریا کوٹ میں شیخ روح الامین کا مکان کسی وجہ سے گر گیا اور وہ برسوں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے، گھر نصیب نہیں ہوا۔ دوسری طرف ان کے اس عمل سے شیخ ابواسحاق بے حد خوش ہوئے اور ان کے لیے اولاد کی دعا کی۔ شیخ روح الامین کافی معمر ہو چکے تھے، مگر لاولد تھے اور اولاد کی فکر انھیں ستاتی رہتی تھی۔ شیخ ابواسحاق کی دعا کا اثر یہ ہوا کہ معمر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک فرزند سے نوازا جو شیخ ابویحییٰ کے نام سے جانے جاتے تھے۔[۱۵]

شیخ عبدالحق [خلیفہ و بھتیجے]

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے بھتیجے تھے، لہرا میں شیخ کے زیر تربیت تھے۔ شیخ سے انھیں اجازت وخلافت بھی حاصل تھی۔

یہ شیخ کے کس بھائی کی اولاد تھے، شیخ احمد شاہ یا شیخ محمد واجد کی، اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوسکا۔ ان کے نام اور نسبت سے واقفیت شیخ حیدری کی ایک عبارت سے ہوئی ہے۔ شیخ ابوالغوث جب لہرا سے غازی پور کے لیے نکلے تو صرف دو آدمیوں کو اپنا راز دار بنایا تھا: ایک شیخ حیدری کو اور دوسرے شیخ عبدالحق کو۔ شیخ عبدالحق کے بارے میں صراحت موجود ہے کہ وہ لہرا سے

محمد آباد تک شیخ کے قدم بہ قدم ساتھ تھے، آگے بھی ساتھ گئے یا نہیں، اس کی صراحت نہیں ملتی ہے۔ قیاس یہی ہے کہ غازی پور تک ساتھ رہے ہوں گے، محمد آباد رکنے اور شیخ کو تنہا چھوڑنے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی۔ شیخ شمس الدین کی عبارت یہ ہے:

> خلیفۂ برحق شاہ عبدالحق برادر زادۂ حقیقی آں حضرت را کہ دراں وقت در کسبِ حقائق بخدمت ممتاز بودند، محرم راز ساختہ باتفاق برائے تفحص در بیاباں درآمد بسعی تمام بپابوس آں خضر بادیہ معرفت سعادت اندوز گشت ہر چند بعرض رسانید کہ ساعتے چند توقف شود تا کہاراں را سوارے بہم رسند موافق رائے صواب اندیش نیامد، پیادہ پا تا محمد آباد تشریف بردند، شاہ عبدالحق چوں سایہ از عقب می رفت۔ [۱۶]

''حضرت نے اپنے بھتیجے اور خلیفہ جو اس وقت آپ کے خادموں میں کسبِ حقائق میں سب سے ممتاز تھے، شاہ عبدالحق کو بھی اس کی اطلاع کر دی تھی۔ وہ اتفاق سے حضرت کی تلاش میں بیابان میں نکلے اور بڑی مشکل سے آپ کو پایا۔ باصرار درخواست کی کہ تھوڑی دیر رک جایئے، تا کہ کہاروں کی سواری کا انتظام کر دیا جائے، مگر آپ نے ان کی درخواست قبول نہیں کی اور پیدل محمد آباد تشریف لائے۔ آپ کے پیچھے سائے کی طرح شاہ عبدالحق بھی تھے۔

حواشی وحوالے

۱- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ص ۶۸، ۶۹

۲- ایضاً، ص ۷۰

۳- ایضاً، ص ۷۳

۴- مولانا عبدالحیٔ حسنی، نزہۃ الخواطر، مکتبہ دارعرفات، رائے بریلی، ۱۹۹۲، جلد ۷، ص ۱۱

۵- شاہ محمد فاخر کی ولادت الہ آباد میں ۱۱۲۰ھ [۱۷۰۸ء] میں ہوئی، شیخ محمد یحییٰ کے خلف الصدق اور شیخ محمد افضل الہ آبادی کے نواسے ہیں۔ والد بزرگوار کے زیر تربیت تعلیم حاصل کی اور بچپن ہی میں نانا محترم نے انھیں مرید کر لیا تھا۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے۔ سفر حجاز میں علم حدیث شیخ

محمد حیات سندھی مدنی سے حاصل کیا۔ پہلی مرتبہ ۱۱۴۱ھ [۱۷۲۹ء] میں عازم حرمین شریفین ہوئے اور ۱۱۵۰ھ [۱۷۳۷ء] میں حج کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ دوسری مرتبہ ۱۱۵۴ھ [۱۷۴۱ء] میں الہ آباد سے حرمین شریفین کے ارادے سے نکلے اور سورت میں جہاز کے انتظار میں قیام پذیر رہے، صفر ۱۱۵۶ھ میں جہاز پر سوار ہوئے مگر راستے میں جہاز حادثے کا شکار ہو گیا، جس کی وجہ سے مخ میں اقامت کرنی پڑی۔ ۲۲ رمضان ۱۱۵۶ھ [۹ نومبر ۱۷۴۳ء] کو مکہ معظّمہ پہنچے اور حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے۔ تیسری مرتبہ حج کے ارادے سے ۵ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ [۲۵ اکتوبر ۱۷۵۱ء] کو برہان پور پہنچے، برہان پور پہنچنے کے بعد سرسام کا عارضہ لاحق ہو گیا، بیماری رفتہ رفتہ بڑھتی رہی، یہاں تک کہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ [۳۱ اکتوبر ۱۷۵۱ء] شنبہ کو اشراق کے وقت وفات ہوئی۔ وفات سے پہلے انھوں نے وصیت کی تھی کہ مجھے مشائخ برہان پور کے پہلو میں دفن کیا جائے، چنانچہ وصیت کی تعمیل میں انھیں شیخ عبداللطیف برہان پوری کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

علم حدیث میں انھیں قابلِ رشک عبور حاصل تھا، فقہی معاملات میں براہ راست کتاب وسنت سے اجتہاد پر عامل تھے۔ محدث کی حیثیت سے شیخ فاخر کی شہرت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اتباعِ سنت کے بڑے پابند تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کا ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ میں نے بے شمار علما و دیگر مشائخ کو دیکھا، گیارہ سو سال کے بعد ایک شخص جس کا نام شیخ محمد فاخر ہے، اسے کتاب وسنت کے موافق پایا۔ بے شمار اربابِ کمال کو پرکھا مگر شیخ محمد فاخر کا ہم پلہ کسی کو نہ دیکھا۔ مرزا مظہر جان جاناں طبیعت کے خلاف کبھی کبھار شیخ محمد فاخر سے ملاقات کے لیے پہنچتے رہتے تھے۔

شیخ محمد فاخر جید محدث ہونے ساتھ فارسی کے عمدہ شاعر بھی تھے، زائر تخلص کرتے تھے اور صاحبِ دیوان تھے۔ صاحبِ تاریخ مشائخ الہ آباد [محمد نظام الدین] کی صراحت کے مطابق ان کا دیوان کتب خانہ اجملیہ میں موجود تھا۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرہ سرو آزاد - از میر غلام علی آزاد بلگرامی، تحقیق تدوین وتصحیح: ڈاکٹر زرینہ خان، سال اشاعت ۲۱۰۳ء ص ۴۴۲ تا ۴۵۴۔ تاریخ مشائخ الہ آباد، تراجم علماے حدیث ہند، نزہۃ الخواطر]

۵- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۴۶۳، ۴۶۴

٦- عبیدالرحمان صدیقی، مشائخ غازی پور، انیس پبلی کیشنز، صمد منزل مچھرہٹہ غازی پور، ۲۰۰۱ء، ص، ۴۳۰

٧- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۹۷، ۹۸

٨- ایضاً، ص ۲۰۳

٩- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۴۵۷، ۴۵۸

١٠- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۵

١١- ایضاً، ص ۸۵ تا ۹۰

١٢- ایضاً، ص ۵۳

١٣- سید اقبال احمد جون پوری، تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیائے جون پور، ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس محلہ رضویخاں جون پور، جنوری ۱۹۸۸ء: ص ۱۳۷

١۴- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۲۰۱، ۲۰۲

١۵- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۴۵۶ تا ۴۵۹

١٦- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۱۹۲

◆ ◆ ◆

تعارف ''البدائع''

البدائع شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی تصنیف ہے۔ یہ انتہائی نادراورکم یاب کتاب ہے۔ شیخ ابوالغوث کے تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے اس کتاب کا ذکرنہیں کیا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے بڑی تحقیق وتفصیل سے شیخ ابوالغوث کا ذکر کیا ہے، مگر انھوں نے بھی کہیں اس تصنیف کا ذکرنہیں کیا۔ مناقبِ غوثی کے صفحات بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ شیخ ابوالغوث کے مکاتیب میں صرف ایک جگہ اس کتاب کا سرسری ذکر آیا ہے:

''فقیر ذکرِ نمازِ خاصاں بجاے دیگر آوردہ ''اوراد بدائع اربع'' نوشتہ است، ہر کرا رغبت باشد آں جا در یابد۔''[۱]

فقیر نے خاصانِ خدا کی نماز کا تذکرہ ایک دوسری جگہ یعنی ''اوراد بدائع اربع'' میں کیا ہے، جس کو شوق ہو وہاں دیکھ لے۔

ہمارے سامنے جو کتاب ہے وہ بدائع کا ترجمہ ہے۔ مترجم ہیں علامہ ریاض احمد سعیدی۔ یہ ترجمہ انھوں نے مفتی شمس الضحیٰ سجادہ نشین آستانہ شاہ ابوالغوث دھاوا غازی پور کے حکم سے کیا ہے۔ اپریل ۲۰۰۶ء میں ماہ نور پبلی کیشنز ۴۱۹ جامع مسجد مٹیا محل، دہلی-۶ سے شائع ہوا ہے۔ صفحات ۳۹۹ ہیں۔

عرض مترجم سے کتاب کی ابتدا ہوتی ہے جس کی پہلی سطر میں یہ اطلاع دی گئی ہے:

''مخدوم شاہ ابوالغوث گرم دیوان رحمہ اللہ کی یہ وہ نادر و نایاب کتاب ہے جو پہلی دفعہ اصل عربی فارسی متن اور ترجمہ کے ساتھ منظر عام پر آ رہی ہے۔''[۲]

کتاب میں عربی و فارسی متن ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ عربی متن سے مراد اگر قرآنی

آیات، احادیث اور وظائف و دعائیں ہیں تو وہ یقینا کتاب میں ترجمہ کے ساتھ موجود ہیں، رہی بات فارسی متن کی تو وہ صرف ابتدا میں ڈیڑھ صفحہ ہے، باقی پوری کتاب میں صرف ترجمہ ہی ترجمہ ہے۔ ترجمہ کے ساتھ کتاب کے شروع یا اخیر میں اگر پورا فارسی متن بھی شامل ہو گیا ہوتا تو کتنا بہتر ہوتا۔

عرضِ مترجم میں مترجم نے اصل متن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی ہے کہ آیا وہ مطبوعہ ہے یا مخطوطہ؟ اگر مطبوعہ ہے تو اس کا سالِ طباعت کیا ہے، کہاں سے طبع ہوا ہے اور کتنے صفحات ہیں؟ اور اگر مخطوطہ ہے تو انھوں نے کہاں سے حاصل کیا، فی الحال وہ کس کی ملکیت میں ہے اور اس قلمی نسخے کی کیا کیفیت و حالت ہے۔ ایک جگہ صرف اتنا لکھا ہے:

> ''کرم خوردہ کتاب ہونے کی وجہ سے بعض مقامات میری سمجھ سے بالاتر تھے وہ عربی اور فارسی کی چند عبارات ویسے ہی لکھ دی گئی ہیں۔''[۳]

اس عبارت میں ''کرم خوردہ کتاب'' کے الفاظ سے اشارہ مل رہا ہے کہ مطبوعہ کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے، مگر چند سطر اوپر تعارف میں لکھ آئے ہیں کہ 'یہ وہ نادر و نایاب کتاب ہے جو پہلی دفعہ اصل عربی فارسی متن اور ترجمہ کے ساتھ منظر عام پر آ رہی ہے۔'[البدائع: ۴] پہلی دفعہ منظر عام پر آنے کا مطلب ہے کہ ابھی تک مخطوطہ کی شکل میں تھی۔

بہر کیف! مطبوعہ ہو یا مخطوطہ، مترجم کی ذمہ داری تھی کہ اس کی مکمل وضاحت کرتے اور اس کی حالت و کیفیت کو بیان کرتے۔

شیخ ابوالغوث کے مکتوب میں اس کتاب کا نام جیسا کہ اوپر گزرا ''اوراد بدائع اربع'' آیا ہے اور ترجمہ پر جو نام شائع ہوا ہے، وہ صرف ''البدائع'' ہے۔ یہ بھی ایک معما ہے جس کی وضاحت و صراحت مترجم کو کرنی چاہیے تھی، تاکہ واضح ہو جاتا کہ ان کے پیشِ نظر جو مطبوعہ یا مخطوطہ تھا، اس پر کیا نام درج ہے۔

ترجمہ بالکل درسی انداز کا کیا گیا ہے، ترجمہ میں بعض جگہ الفاظ و جملے میں اتنا الجھاؤ آ گیا ہے کہ مطلب و معنی خبط ہو کر رہ گیا ہے۔ بعض جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مترجم موصوف متن کے مفہوم و معنی سے صرفِ نظر کر کے صرف الفاظ کا طوطا مینا سجا رہے ہیں۔ یہ احساس ان مقامات

پر زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے جہاں تصوف کی طویل اصطلاحات مذکور ہیں۔ قرآنی آیات کا ترجمہ چوں کہ اہتمام سے سید احمد سعید شاہ کاظمی ملتان پاکستان کے ترجمۂ قرآن 'البیان' سے لیا گیا ہے، اس لیے اس کی عبارت سہل اور سلیس ہے۔

مترجم نے آیاتِ قرآنی اور احادیث کی ضبطِ اعراب کے ساتھ تخریج کر دی ہے اور تمام اوراد و وظائف اور دعاؤں پر بھی اعراب لگا دیا ہے، جس سے پڑھنے والوں کو بڑی سہولت ہو گئی۔ یہ ایک عمدہ اور ضروری کام تھا، جسے انھوں نے انجام دیا۔ فجزاہ اللہ خیرا کثیرا فی الدارین

اس کتاب کا موضوع تصوف کے مسائل و مباحث اور وہ اعمال و افعال اور اوراد و وظائف ہیں جن کے ذریعے متصوفین سلوک کے منازل طے کرتے ہیں اور تزکیہ و تطہیر کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب میں چار بدیعے ہیں۔ پہلے اور دوسرے بدیعے میں چار چار فصلیں ہیں، تیسرا بدیعہ فصل کی تقسیم سے خالی ہے۔ چوتھے بدیعے کے بارے میں مترجم کا کہنا ہے:

''چوتھا بدیعہ تصوف کے دقیق مسائل پر مشتمل ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا، کیوں کہ آسان فہم ترجمہ کے باوجود عوام کے لیے زیادہ مفید نہ ہوتا، لیکن علما اور اہل ذوق حضرات کے لیے ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے۔'' [۴]

چوتھے بدیعہ کا ترجمہ نہ سہی، کم از کم متن ہی کتاب میں شامل کر دیے ہوتے، تا کہ کم از کم اس کی نوعیت اور کیفیت کا علم ہو جاتا۔

کتاب کا سببِ تالیف جو شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی عبارت میں مذکور ہوا ہے، وہ یہ ہے:

پس ازیں می گوید بندہ راجی برحمۃ اللہ الجلیل ابوالغوث محمد شاہ اسماعیل کہ برادرِ دین و محب نعلین شیخ بدیع الدین التماس نمود کہ طریق سلوک و بیان توحید و وظائف اوقات خمسہ بہ ترتیب کہ از خدمت مرشدی و استاذی مجاز گشتۂ، برائے یادگارے بر صفحہ روزگار نیست، نمائی، تا طالبان بہرہ یابند۔ اگرچہ از کثرت جذبات الٰہی بہ ہوش ایں معنی وقت مساعدت نمی کرد، اما پاسِ

خاطر آں عزیز اں دعوت باجابت رسید، فوائد چند ترقیم نمودہ۔[۵]

اس کے بعد رب جلیل کی رحمت کا امیدوار بندہ ابوالغوث محمد شاہ اسماعیل کہتا ہے کہ دینی بھائی اور نعلین سے محبت رکھنے والے شیخ بدیع الدین نے درخواست کی کہ طریق سلوک، توحید کے بیان اور پانچوں اوقات کے وظائف کی جس ترتیب سے آپ کو پیر و مرشد کی طرف اجازت ملی ہے، وہ بہ طور یادگار کہیں درج نہیں ہیں، آپ لکھ دیجیے، تا کہ طالبانِ سلوک اس سے نفع اٹھا سکیں۔ اگر چہ جذباتِ الٰہی کی کثرت کی وجہ سے اس فرمایش کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں مل پا رہا تھا، مگر عزیزوں کی تالیفِ قلب کے لیے ان کی فرمایش قبول کر لی اور چند فوائد لکھ دیے گئے ہیں۔

پہلے بدیعہ میں چار فصلیں ہیں۔ فصلِ اول کا عنوان ہے:

شریعت عالم ناسوت ورد زبان بحرف وصوت مقام خدمت ودنی نفس مزکی روح القدس جبرئیل نصیراً پیشانی کے بیان میں۔

پہلی فصل صفحہ ۱۲ سے ۲۱۵ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس فصل میں قرآنی آیات، احادیث میں وارد وظائف، دیگر اوراد اور درود و استغفار مذکور ہیں اور ان کے پڑھنے کے اوقات و مقامات اور احوال و کیفیات کا ذکر ہے۔

دوسری فصل کا عنوان ہے:

رات دن کے اوراد اور نمازوں کے ذکر میں۔

یہ فصل صفحہ ۲۱۶ سے ۲۴۹ تک ہے۔ اس فصل میں دن و رات میں پڑھے جانے والے وظائف اور نمازوں سے قبل و بعد کی دعائیں اور اوراد مذکور ہیں۔

تیسری فصل کا عنوان ہے:

سال اور مہینوں کے وظائف اور نمازوں کے بیان میں۔

یہ فصل ۲۵۰ سے ۳۱۷ صفحے تک ہے۔ اس فصل میں محرم سے ذی الحجہ تک ہر مہینے کی خاص عبادتوں اور ان میں پڑھے جانے والے اوراد و وظائف کی تلقین ہے۔ اور اس کی بھی تعیین ہے کہ کس مہینے کی کون کون سی تاریخ اور دن نحس ہیں۔

چوتھی فصل کا عنوان ہے:

نمازِ حاجات کے بیان میں اور حاجت دین کا فضل ہے۔اعظم دین اللہ تعالی کی خوش نودی، باری تعالی اوراس کے رسول کا دیدار ہے۔اس مقام میں کہ وہ بے داری کا مقدمہ ہے۔

یہ فصل صفحہ ۳۱۸ سے ۳۴۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔اس فصل میں نماز کے ان طریقوں اوراورادووظائف کا ذکر ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے باری تعالی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔

دوسرے بدیعہ میں بھی چار فصلیں ہیں۔پہلی فصل کا عنوان ہے:

طریق چشتیہ کے اذکار کی شرطیں،جن کا خلاصہ دس چیزیں ہیں:

[۱]وضو پر دوام، [۲] تاریک حجرہ میں تنہائی،[۳]خاموشی، [۴]تھوڑا کھانا، [۵] معتدل بے داری،[۶] خیر وشر سے نفی خواطر،[۷]تمام احوال میں اپنی ذات کوسلامت رکھنا، [۸] کوئی معین خادم بنانا،[۹] فرائض کے سوا تمام اعمال ترک کرنا،[۱۰] قبلہ رخ بیٹھ کر تمام اوقات میں زبان سے حضورِدل کے ساتھ ذکر کرنا۔

یہ فصل ۳۴۴ سے ۳۵۶ صفحے تک ہے۔اس فصل میں نفس کے اقسام اور طریقۂ چشتیہ کے اذکار کے مختلف طریقوں کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسری فصل میں سلسلۂ قادریہ کے ذکر کے طریقوں کو بیان کیا گیا۔وہ اذکار جن کے طریقے اورآداب بیان کیے گئے ہیں،ان کے نام یہ ہیں:

نفی و اثبات، ذکر ہو، ذکرغوثیہ،ذکر کشف الارواح، ذکر کشف الحقائق،ذکر کشف القبر ، ذکرفنا و بقا، ذکر میکائیل، ذکر کروبیاں،ذکر سیر وسفر،ذکر نور،ذکر یا حی و یا قیوم، ذکر حق ہو، ذکر ضمائر، ذکر حدادی، ذکر دل، ذکر خفی، ذکر استلقا، ذکر سہ ضربی، ذکر چہار ضربی، ذکر پنج ضربی، ذکر شش ضربی، ذکر جاروب۔

ان کے علاوہ چلہ کی تین قسمیں یعنی اربعین محمدی، اربعین عیسیٰ اوراربعین موسی کا ذکر ہے اوران چلوں کے ایام کی تعیین بھی ہے۔توجہ کا طریقہ اور واردات کی نوعیں یعنی وحی، الہام، ندا، ہاتف اورالقا کا بھی بیان ہے۔

تیسری فصل میں اذکارِقلندریہ کا بیان ہے۔یہ فصل محض تین صفحے پر مشتمل ہے۔اذکارِ

قلندریہ میں جن اذکار کے طرق، شرائط اور آداب کا بیان ہے، وہ یہ ہیں:

ذکر آحاد، ذکر ثنائی، ذکر ثلاثی، ذکر ثلاثی کبیری، ذکر رباعی، ذکر خماسی، ذکر سداسی، ذکر حدادی، ذکر گزر، ذکر کوب، ذکر دمہ وجاروب اور ذکر منادی۔

تیسری فصل اذکار نقش بندیہ کے بیان میں ہے۔ اس فصل میں صرف ایک صفحہ اور ایک ذکر اور اس کے دو طریقوں کا بیان ہے۔ وہ ذکر ہے ذکر خفی۔

تیسرے بدیعے میں مختلف اشغال، تصورات، تجلیات، مراقبے اور ذکر کے متعدد آسن کا بیان ہے۔

کتاب کی ابتدا میں جو تمہیدی باتیں اور کتاب کا مختصر تعارف ہے، اس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ چوتھے بدیعے میں تجلیات کا بیان ہے اور ترتیب وار اس میں سات تجلی بیان ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم

اصل کتاب ہماری نگاہ سے نہیں گزری ہے۔ اوپر جو تعارف لکھا گیا ہے، وہ حقیقت میں ترجمے کا تعارف ہے، اصل کتاب کا تعارف نہیں ہے۔ ترجمے میں اصل کتاب کے بارے میں کچھ لکھا نہیں گیا ہے، اس لیے تلاش و کوشش کے باوجود اصل تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی۔ اس لیے ترجمہ ہی کے تعارف پر اکتفا کرنا پڑا۔

حوالے

۱- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۵۳
۲- علامہ ریاض احمد سعیدی، البدائع، ماہ نور پبلی کیشنز ۱۹۴ جامع مسجد مٹیا محل، دہلی-۶، اپریل ۲۰۰۶ء، ص ۴
۳- ایضاً، ص ۴
۴- ایضاً، ص ۴
۵- ایضاً، ص ۵

◆ ◆ ◆

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے تذکروں کا تجزیاتی مطالعہ

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے تذکرہ اور سوانح کا سب سے قدیم ماخذ مناقبِ غوثی ہے جو ان کے ایک مرید وخلیفہ شیخ شمس الدین حیدری کی فارسی تصنیف ہے۔ اس کا ذکر وتعارف دیباچے میں گزر چکا ہے۔

بحر زخار

دوسرا قدیم تر تذکرہ شیخ ابوالغوث گرم دیوان کا جو ملتا ہے، وہ بحر زخار میں ہے۔ بحر زخار شیخ وجیہ الدین اشرف اودھی کی بڑی اہم تصنیف ہے۔ یہ تیرہویں صدی ہجری کے ابتدا یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں تقریباً ۲۸۰۰ بزرگان دین اور عارفان باللہ کا تذکرہ ہے جن میں دو ہزار سے زائد ایسے صوفیا ہیں جن کا تعلق ہندستان سے ہے۔ [۱] ہندستان کے بہت سے غیر معروف بزرگوں کا تنہا منبع و ماخذ یہی کتاب ہے۔

شیخ وجیہ الدین اشرف رسولی کے رہنے والے تھے، ان کے والد شیخ غلام رسول بڑے ذی استعداد عالم تھے اور وقت کے بڑے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شیخ وجیہ الدین کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار کے پاس ہوئی، اس کے بعد مفتی یعقوب کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور ان کے مقرب و خاص شاگرد بنے۔ جوانی کے ایام مشائخ کی خدمت، کسبِ معرفت، تہذیبِ نفس اور اکتسابِ علم میں بسر کیے۔ فارسی شعر و ادب کے بڑے عالم تھے، صوفیا کے احوال و آثار اور ان کی کرامات سے بے حد شغف تھا۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے اخیر عمر میں بینائی ختم ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے زندگی کے آخری ایام بڑی عسرت و تنگ دستی میں گزرے۔

ان کی تاریخ ولادت و وفات کا سراغ نہیں ملتا، بس اتنا ہے کہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں وہ موجود تھے۔ مزار جون پور میں واقع ہے۔[۲]

بحر زخار تصنیف کے بعد سے ایک طویل مدت تک مخطوطے کی شکل میں رہی۔ ۲۰۱۱ء میں پروفیسر آذرمیدخت صفوی نے تصحیح و تدوین کے بعد تین جلدوں میں علی گڑھ سے شائع کیا۔ ہمارے پیش نظر مطبوعہ نسخہ ہے۔

بحر زخار کے تذکرے میں شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے متعدد ایسے مریدین کے نام ملتے ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ مثلاً مولوی رحمت اللہ قدوائی، [شاہ بدر عالم قدوائی کے بھائی] میر غلام محمد محمد آبادی، میر احمد اللہ گورکھ پوری، شاہ عبدالکریم دکنی، شاہ نور محمد ہیزم فروش اکبرآبادی، شاہ عبداللطیف اور شاہ ولی۔

ان اسما میں میر غلام محمد محمد آبادی کا ذکر مناقبِ غوثی میں بحیثیت استاذ آیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ مناقب میں میر غلام محمد کی بجاے سید غلام محمد لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ میر غلام محمد محمد آبادی [مرید] الگ ہوں اور سید غلام محمد [استاذ] الگ ہوں۔

بحر زخار میں ہے:

''چوں حضرت گرم دیوان وفات یافت در قریہ ولید پور بھیرہ توابع اعظم گڑھ وطن خود مدفون شد۔''[۳]

بحر زخار کی یہ اطلاع درست نہیں ہے۔ شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی وفات وحدت آباد لہرا میں ہوئی اور وہیں مدفون ہیں۔ لہرا میں ان کا مزار آج بھی موجود ہے۔

آگے لکھا ہے:

''بالفعل شاہ عبداللہ خلیفہ او قایم مقام است۔''[۴]

بحر زخار کی یہ اطلاع بھی محل نظر ہے۔ کیوں کہ شیخ ابوالغوث گرم دیوان نے تحریری طور پر وفات سے قبل اپنا خلیفہ و جانشین شاہ معشوق علی غازی پوری کو بنا دیا تھا۔[۵] شیخ کی وفات کے بعد انھیں ہٹا کر اہل خاندان اور مریدوں نے شاہ ابوسحاق کو ان کی جگہ بٹھا دیا تھا۔ اس کی تفصیل اولاد و خلفا کے باب شاہ معشوق اور شیخ روح الامین کے تذکرے میں آپ کو ملے گی۔

شیخ ابوالغوث کے متعلقین میں عبداللہ نامی ایک فرد کا نام ملتا ہے۔ وہ ہیں ان کے ماموں زاد بھائی اور برادرِ نسبتی، شیخ ابوالغوث کے ماموں شیخ منور کے بیٹے شیخ عبداللہ۔ یہ موضع نھو پور سپاہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندان بھی تصوف وصوفیا سے منسلک تھا اور خاندان کے افراد نے سپاہ میں خانقاہ بھی آباد کر رکھی تھی۔ مناقب غوثی میں ایک جگہ اشارتاً ذکر ملتا ہے کہ گرم دیوان صاحب کچھ دنوں سپاہ کی خانقاہ میں بھی جا کر رہے ہیں[۶]۔ ممکن ہے کہ بحیثیت مرشد ان کا تعلق وہاں کی خانقاہ سے بھی رہا ہو اور انتقال کے بعد وہاں کی خانقاہ میں سجادہ نشین شیخ عبداللہ بنے ہوں۔ اور صاحبِ بحر زخار کو صرف سپاہ کے جانشین کا علم ہوا ہو، دوسرے جانشین کا علم نہ ہو سکا ہو۔

نزہۃ الخواطر

نزہۃ الخواطر میں مولانا عبدالحیٔ حسنی صاحب نے شیخ ابوالغوث کا آٹھ سطری تذکرہ لکھا ہے اور ان کے لیے الشیخ العارف کا لقب استعمال کیا ہے۔ اس تذکرے میں بھی کچھ سہو در آئے ہیں:

۱- نام ابوالغیث درج ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ درست نام ابوالغوث ہے۔ بحر زخار کے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے قلمی نسخے میں بھی ابوالغیث مذکور ہے۔[۷] ممکن ہے مولانا عبدالحیٔ حسنی صاحب نے وہیں سے نام اخذ کیا ہو۔

۲- تاریخ وفات کے سلسلے میں لکھا ہے:

مات لاربع بقین من جمادی الآخرۃ سنۃ سبع و سبعین ومئۃ الف بولید پور فدفن بہا۔ [۸]

یعنی ۲۶ جمادی الثانیہ ۱۱۷۷ھ کو وفات ہوئی۔ درست تاریخ وفات جو مناقب غوثی میں مذکور ہے اور بیشتر تذکرہ نگاروں نے جس پر اعتماد کیا ہے، وہ ۲۵ جمادی الثانیہ ۱۱۷۸ھ ہے۔

۳- تاریخ مکرم کے حوالے سے وفات و تدفین دونوں ولید پور میں مذکور ہے۔ یہی اطلاع بحر زخار میں بھی درج ہے۔ جب کہ درست یہ ہے کہ وفات و تدفین دونوں وحدت آباد لہرا میں ہوئی۔

قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے شیخ ابوالغوث گرم دیوان کا سب سے زیادہ تفصیلی تذکرہ لکھا ہے۔ 'دیار پورب میں علم اور علما' میں شامل تذکرے کی استنادی حیثیت دیگر تذکروں کے مقابلے میں بہت بڑھی ہوئی ہے۔ یہ تذکرہ ان کی دو کتاب دیار پورب میں علم اور علما اور شجرۂ مبارکہ یعنی تذکرہ علمائے مبارک پور میں شائع ہوا ہے۔ آخر الذکر میں جو تذکرہ ہے، وہ اول الذکر کی تلخیص ہے، مستقل تذکرہ نہیں ہے۔ دیار پورب میں قاضی صاحب نے شیخ ابوالغوث کے ضمن میں ان کی اولاد، خلفا اور شاگردوں کے تذکرے بھی لکھ دیے ہیں جس سے ان کی پوری زندگی اور متعلقین پر سرسری نظر ہو جاتی ہے۔ اپنی اس تحریر میں ہم نے قاضی صاحب کے اس تذکرے اور ولید پور و بھیرا سے متعلق دیگر بزرگوں کے تذکروں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے شیخ ابوالغوث کے شاگردوں میں ایک نام حافظ محمد علی کا شمار کرایا ہے اور ان کو شیخ ابوالغوث کا صحبت یافتہ بھی بتایا ہے۔ حافظ محمد علی کا ذکر مناقبِ غوثی میں ہے اور یہ غازی پور میں نواب فضل علی خان کی طرف سے شیخ ابوالغوث کی خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔ مناقبِ غوثی کی عبارت یہ ہے:

''حافظ محمد علی از اولاد کبار قدوۃ السالکین شاہ احمد عبدالحق رودولوی کہ سوائے حقوق استاذی صحبت مصاحبت گرم داشت، مامور شد کہ بملازمت حضرت دام ظلہ مشرف شدہ ہم رکاب سعادت انتساب در قاسم آباد آمدہ ہر یک را از جہت تاکیدات بلیغ نمودہ بہ تعجیل تمام پیش من آیند۔''[۹]

اس عبارت میں غالباً ''مصاحبت گرم'' سے قاضی صاحب نے گرم دیوان مراد لے لیا اور اسی مناسبت سے ''حقوق استاذی'' کا تعلق بھی گرم دیوان سے جوڑ دیا اور یہ دکھا دیا کہ حافظ محمد علی شیخ گرم دیوان کے صرف شاگرد ہی نہیں، صحبت یافتہ بھی تھے۔ میرے ناقص فہم میں یہ بات آتی ہے کہ ''حقوق استاذی'' کا تعلق حافظ محمد علی سے ہے۔ یعنی حافظ محمد علی نواب فضل علی خان کے استاذ تھے۔ اور ''مصاحبت گرم'' سے مراد یہ ہے کہ وہ استاذ ہونے کے ساتھ نواب فضل علی خان

کے حاضر باش مصاحب بھی تھے۔اب مطلب یہ ہوگا:

حافظ محمد علی قدوۃ السالکین شاہ احمد عبدالحق رودولوی کی اولاد میں سے ہیں، وہ حقوقِ استاذی کے علاوہ سرگرم مصاحبت بھی رکھتے تھے، وہ مامور ہوئے کہ حضرت دام ظلہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے ساتھ قاسم آباد آئیں اور ہر ایک کو سخت تاکید کر کے بعجلت تمام میرے پاس واپس آجائیں۔

''مصاحبت گرم'' سے گرم دیوان مراد نہ ہونے کی ایک مضبوط وجہ یہ بھی ہے کہ شیخ شمس الدین حیدری نے پوری کتاب میں ہر جگہ شیخ ابوالغوث کو'مرشد حقیقی' لکھا ہے، کہیں بھی القاب و آداب کے بغیر ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔تو پھر یہاں القاب وآداب کے بغیر محض گرم لکھنا نہ صرف ان کی دیرینہ عادت کے خلاف ہے، بلکہ سمجھ سے بھی بالا ہے۔

اس عبارت کا پس منظر یہ ہے کہ شیخ ابوالغوث جب لہرا سے بہ راہ مئو غازی پور کے لیے چلے ہیں تو ابھی مئو پہنچے تھے کہ نواب فضل علی خان کا خط آیا کہ میں مملکت کے انتظام میں گھر سے باہر ہوں اور مصروف ہوں، آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ جیسے ہی فارغ ہوں گا فوراً حاضری کی سعادت حاصل کروں گا۔اس کے بعد قاسم آباد جہاں وہ رہتا تھا، وہاں خط لکھ کر اپنے ملازموں کو پرجوش استقبال کی تاکید کی اور پھر حافظ محمد علی کو بھیجا کہ راستے ہی میں شیخ ابوالغوث سے مل کر پورے اہتمام واحترام سے انھیں قاسم آباد لے کر جایئے، وہاں سب کو خدمت گزاری کی تاکید کر کے جلد از جلد میرے پاس واپس آجایئے۔

تذکرہ علماے اعظم گڑھ

تذکرہ علماے اعظم گڑھ میں مولانا حبیب الرحمان اعظمی صاحب نے تین صفحے میں شیخ ابوالغوث گرم دیوان کا تذکرہ لکھا ہے۔اس تذکرے کا بیشتر حصہ قاضی صاحب کی کتاب تذکرہ علماے مبارک پور سے ماخوذ ومستفاد ہے۔قاضی اطہر مبارک پوری صاحب کے زیر اثر مولانا حبیب الرحمان صاحب نے بھی لکھا ہے کہ شیخ ابوالغوث کے جد امجد شیخ خضر اپنے فرزند شیخ محمد کے ساتھ جون پور وارد ہوئے،[۱۰] مگر پھر اگلے صفحے کے حاشیے میں تجلی نور کے حوالے سے لکھا ہے:

تجلی نور سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے شیخ محمد اپنے اہل وعیال کے ساتھ جون پور آئے تھے، شیخ خضر کا کوئی ذکر نہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ خضر کی وفات دہلی ہی میں ہوئی۔ واللہ اعلم [۱۱]

آباواجداد کے باب میں صاحبِ مناقب کی صراحت گزر چکی ہے کہ شیخ خضر کا انتقال دہلی ہی میں ہوا اور وہیں ان کی قبر ہے۔

جا گیر اور بھیرا کے توطن کے سلسلے میں لکھا ہے:

''جا گیر ملنے کے بعد یہ خاندان جون پور سے منتقل ہو کر بھیرا مستقل طور سے آباد ہو گیا۔'' [۱۲]

جون پور سے یہ خاندان بھیرا نہیں بلکہ ولید پور میں آباد ہوا تھا، اس وقت بھیرا نام کی کوئی آبادی نہیں تھی۔

شیخ ابوالغوث کے مرشد کا نام شاہ فتح محمد حسینیؒ ''میدانوی'' کتاب میں درج ہے، [۱۳] تذکرہ علماے مبارک پور میں بھی 'میدانوی' لکھا ہے [۱۴] مگر دیار پورب میں علم اور علما میں سیدانہ کی صراحت موجود ہے [۱۵] غالباً علماے مبارک پور میں میدانوی سہو کتابت ہے اور اسی کے زیر اثر مولانا حبیب الرحمان صاحب بھی میدانوی لکھ گئے ہیں۔ بحر زخار میں شاہ فتح محمد کے تعارف میں لکھا ہے:

''بزرگانش از سبزوار بہ ہندآمدہ درقریہ سیدانہ معمولہ توابع الہ آباد سکونت گزیدند۔'' [۱۶]

قاضی صاحب نے دیار پورب میں علم اور علما میں ایک مقام پر وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مولانا فتح محمد ان [شیخ ابوالغوث] کو لے کر اپنے گاؤں سیدانہ گئے۔ [۱۷] اس لیے درست سیدانوی ہونا چاہیے۔ مناقبِ غوثی میں سیدانہ کی جگہ سیدآباد [۱۸] لکھا ہے، جو کہ صحیح نہیں ہے۔

مولانا حبیب الرحمان صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:

''شاہ ابوالغوث سے بے شمار خلقِ خدا کو فیض پہونچا، جن میں آپ کے صاحبزادے شاہ ابواسحاق بھیروی لہراوی اور بھتیجے شاہ عبدالحق اور شاہ معشوق علی غازی پور خاص اہمیت اور شہرت کے مالک ہیں۔'' [۱۹]

شاہ ابواسحاق کے بارے میں تو درست ہے کہ وہ شہرت کے مالک ہیں، ان کا تذکرہ پرانے تذکروں کی بیشتر قابلِ ذکر کتابوں میں مل جاتا ہے، مگر شاہ عبدالحق کی شہرت اور تذکرے کا حال یہ ہے کہ مناقبِ غوثی میں محض ایک جگہ ضمناً ان کا ذکر آیا ہے، جس سے صرف ان کے نام اور شیخ ابوالغوث کے بھتیجا اور خلیفہ ہونے کا علم ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ شاہ معشوق علی غازی پوری کا ذکر تذکرہ علماے ہند میں بس اتنا آیا ہے کہ وہ شیخ ابوالغوث کے اجل خلفا میں سے تھے۔ قاضی اطہر صاحب نے دیار پورب میں علم اور علما میں احسن الانساب بنوالعباس چریاکوٹ [قلمی] مصنفہ محمد نبی عباسی چریاکوٹی کے حوالے سے ایک واقعے کا اضافہ کیا ہے [اس واقعے کا ذکر شاہ معشوق علی کے تذکرے میں گذر چکا ہے] اور اس کا اضافہ کیا کہ شیخ ابوالغوث نے تحریری طور پر ان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا [۲۰]۔ اس سے زیادہ کوئی معلومات ان کے بارے میں نہیں ملتی، حتی کہ مشائخ غازی پور کے صفحات بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں اور مشاہیر غازی پور میں ان کا نام تو مذکور ہے، مگر جو اطلاع ہے وہ تذکرہ علماے اعظم گڑھ ہی کے حوالے سے ہے۔ قاضی صاحب نے ان کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں اور ان کے گاؤں کے نام کی تعیین کی ہے، اس کا بھی ذکر نہیں ہے۔

لہرا میں شیخ ابوالغوث کے مزار اور خانقاہ کی حالیہ کیفیت بیان کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمان صاحب نے لکھا ہے:

> ''مزار اور خانقاہ کا علاقہ اب بالکل ویران ہے، مسجد کی دیواریں کھڑی ہیں، جنوب میں خانقاہ اور مدرسہ ٹیلہ کی شکل میں مٹی کا ڈھیر ہیں، دروازوں اور کمروں کی بعض دیواریں اب تک موجود ہیں۔'' [۲۱]

یہی کیفیت بعینہ انھیں الفاظ میں قاضی اطہر مبارک پوری صاحب کی تذکرہ علماے مبارک پور میں بھی درج ہے۔ تذکرہ علماے مبارک پور ۱۹۷۴ء میں طبع ہوئی ہے اور تذکرہ علماے اعظم گڑھ ۱۹۷۶ء میں۔ گویا اس جگہ کی یہ کیفیت ۱۹۷۴ء یا اس سے پہلے کے مشاہدے کی ہے۔ ۲۰۲۰ء میں میرا جانا ہوا تو دیکھا کہ مزار اور خانقاہ کے آس پاس مکانات بن گئے ہیں اور اب وہ حصہ آباد ہو چکا ہے، مسجد شان دار اور کشادہ ہو چکی ہے، جہاں خانقاہ اور مدرسہ تھا، وہ جگہ اب بھی

خالی پڑی ہے، دروازے مہندم ہو چکے ہیں اور کمروں کی دیواریں گر کر زمین کے برابر آ چکی ہیں، بنیاد صاف طور پر نظر آتی ہے جس سے عمارت کے نقشے کا پتا لگانا آسان ہے۔

تذکرہ مشائخ غازی پور

مشائخ غازی پور جناب عبیدالرحمان صدیقی کی تالیف ہے، اس میں شیخ ابوالغوث کا تذکرہ چار صفحات پر محیط ہے۔ بیشتر معلومات قاضی صاحب کی کتاب دیار پورب میں علم اور علما سے مستفاد و ماخوذ ہیں۔ قاضی صاحب کے زیر اثر اس تذکرے میں بھی حافظ محمد علی کو شیخ ابوالغوث کا شاگرد بتایا گیا۔ شیخ ابوالغوث کے غازی پور پہنچنے کا سن ۱۱۶۷ھ [۲۲] لکھا ہے، جو کہ محل نظر ہے۔ مناقب غوثی میں ۱۱۶۴ھ [۲۳] درج ہے۔ حاشیہ میں نزہۃ الخواطر کے حوالے سے مولانا شاہ فتح محمد سیرانوی [۲۴] لکھا ہے۔ حالاں کہ نزہۃ الخواطر میں بھی سیدانوی ہی درج ہے [۲۵] اور درست یہی ہے ۔ شیخ ابوالغوث کی پہلی اہلیہ فاطمہ کی تاریخ وفات ۱۹ ربیع الثانی ۱۱۳۵ھ [۲۶] درج ہے۔ مناقب غوثی میں ۱۹ ربیع الثانی ۱۱۲۵ھ لکھی ہوئی ہے۔ [۲۷]

شیخ ابوالغوث کے غازی پور سے واپسی کی وجہ یہ لکھی ہے:

> ''کچھ دنوں قیام کے بعد آپ واپس وطن چلے گئے، کیوں کہ نواب موصوف [فضل علی خان] کے فوج کی چہل قدمی اور روزانہ ورزش کے سبب آپ کی عبادت و ریاضت میں خلل پڑتا تھا۔'' [۲۸]

مناقبِ غوثی میں غازی پور جانے کا جو سن لکھا ہے، وہ ۱۱۶۴ھ ہے اور وہاں سے واپسی کی تاریخ ۱۰ رجب ۱۱۷۶ھ لکھی ہے۔ [۲۹] اس کا مطلب ہے کہ گرم دیوان صاحب نے غازی پور میں کچھ دن قیام نہیں کیا، بلکہ ۱۲ سال کی طویل مدت تک قیام پذیر رہے۔ اس مدت میں مناقبِ غوثی کے بیان کے مطابق وہاں نواب فضل علی خان نے گرم دیوان صاحب کے لیے خانقاہ بھی تعمیر کی تھی۔ غازی پور سے واپسی کی جو وجہ مناقبِ غوثی میں لکھی ہے، وہ یہ ہے:

> دریں میان بعضے حرکات ناپسندیدہ کہ بارغبار خاطر مرشد حقیقی بود، از وے بہ ظہور آمد۔ [۳۰]

اس درمیان نواب موصوف سے چند ناپسندیدہ حرکتوں کا صدور ہوا جو مرشد حقیقی کے بارِ خاطر کا سبب بن گئیں۔ اور پھر لہرا اور اس کے اطراف کے نئے حاکم کا واپس لہرا آنے کا تقاضا بھی شروع ہوگیا تھا۔ ان سب اسباب کی بنیاد پر شیخ ابوالغوث نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔

اس تذکرے میں شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے خانوادے کے جتنے افراد کا نام آیا ہے، سب کے ساتھ سید کا سابقہ لگا ہوا ہے، جس کی وجہ ہم دیباچے میں ذکر کر چکے ہیں۔ اس تذکرے سے دھاوا کی خانقاہ سے متعلق بعض ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ خاص طور سے شیخ ابوالغوث کے بعد سے اب تک کے سجادہ نشینوں کے نام مل جاتے ہیں اور چند ایک کا تفصیلی ذکر خیر بھی موجود ہے۔ کتاب میں سجادہ نشینوں کا شجرۂ نسب بھی درج ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ گرم دیوان صاحب کے تبرکات جس گنبد کے نیچے دفن ہیں، اس کی تصویر بھی کتاب میں موجود ہے۔

تذکرہ علماے بھیرہ ولید پور

تذکرہ علماے بھیرا ولید پور کے مرتب مولانا ابوالوفا رضوی بھیروی ہیں۔ اس کتاب میں شیخ ابوالغوث کا تذکرہ چھ صفحے میں ہے۔ اس کتاب میں پرانے بزرگوں کے تذکرے کی عمارت ''سرقے اور نقل و چسپاں بلاحوالہ'' پر کھڑی ہے۔ ہم نے اس کتاب پر مفصل تبصرہ لکھا ہے اور صاحبِ کتاب کے ''نقل و چسپاں بلاحوالہ'' کے عمل کی پوری وضاحت کی ہے۔ الگ سے کچھ لکھنے کی بجائے یہاں تبصرے کے اس حصے کو نقل کر دیتے ہیں جو شیخ ابوالغوث سے متعلق ہے۔

''شیخ ابوالغوث گرم دیوان صاحب کا تذکرہ فاضل مرتب نے ۶ صفحے میں درج کیا ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری صاحب نے گرم دیوان صاحب کا بڑا مفصل ذکر کیا ہے، مگر فاضل مرتب نے پوری تفصیل نقل کرنے کی بجائے اپنے کام کی چیزیں قاضی صاحب کے الفاظ و تعبیرات کے ساتھ اپنی کتاب میں نقل کر لی ہیں۔ گویا یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ مکمل تذکرہ چند ایک سطروں کو چھوڑ کر قاضی صاحب ہی نے لکھا ہے۔ شیخ ابوالغوث کے تذکرے میں اتنا کیا کہ دیار پورب میں علم اور علما کا حوالہ دیا ہے، مگر شاید صفحہ نمبر لکھنا بھول گئے۔

اس تذکرہ میں ایک دل چسپ چیز یہ نظر آئی کہ شیخ ابوالغوث کے خطاب گرم دیوان کے سلسلے میں قاضی صاحب نے تذکرہ علماے ہند کے حوالے سے ایک فارسی عبارت نقل کی ہے جس میں خرقِ عادت ان کے جسم کے انتہائی گرم ہوجانے اوراس پر روٹی پک جانے کا ذکر ہے اوراس کے بعد ایک افواہی روایت کا ذکر بھی قاضی صاحب نے کیا ہے۔ اس کے معاً بعد اس روایت کی تردید معتبر دلائل وحوالے سے قاضی صاحب نے کی ہے، مگر فاضل مرتب نے اپنی پسندیدہ باتیں قاضی صاحب کے الفاظ سمیت لے لیں اور تردید والے حصے کو نظرانداز کردیا۔ حالاں کہ انصاف یہ تھا کہ قاضی صاحب کے الفاظ ہی جب نقل کرنے تھے تو مکمل نقل کیے جاتے، تاکہ تصویر کا دونوں رخ سامنے آجاتا۔''

حواشی وحوالے

۱- شیخ وجیہ الدین اشرف، بحر زخار، مرکز تحقیقات فارسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، جلد اول، مقدمہ مصحح، ص بست وچہار۔

۲- ایضاً، ص بست وسہ

۳- ایضاً، ص ۵۶۹

۴- ایضاً، ص ۵۶۹

۵- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۴۵۷

۶- مناقب غوثی میں ہے:

''گویند کہ دراں ایام حضرت مرشد حقیقی دامت برکاتہ حسب درخواست شیخ عبداللہ خان صدیقی درقصبہ سپاہ تشریف داشت۔'' [ص ۷۳]

دوسری جگہ ہے:

''درایامے کہ حضرت مرشد حقیقی دامت برکاتہ درسپاہ تشریف داشت ہریک از خدام وطلبا نیز در

حضور بودند۔'' [ص ۹۱]

ان دونوں عبارتوں کے اشارے سے پتا چلتا ہے کہ شیخ ابوالغوث نے سپاہ میں بھی کچھ ایام بسر کیے ہیں بلکہ ''ہر یک از خدما وطلبا نیز در حضور بودند'' کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سپاہ میں بھی باقاعدہ خانقاہی نظام شیخ ابوالغوث کے ارشاد میں چلتا تھا۔

۷- شیخ وجیہ الدین اشرف، بحر زخار، مرکز تحقیقات فارسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، جلد اول، ص ۵٦۸

۸- مولانا عبدالحئ حسنی، نزہۃ الخواطر، مکتبہ دار عرفات، رائے بریلی، ۱۹۹۲، جلد ٦، صفحہ ۱۷

۹- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۱۹۴

۱۰- مولانا حبیب الرحمان اعظمی، تذکرہ علمائے اعظم گڑھ، مرکز دعوت و تحقیق، دیوبند سہارن پور، طبع دوم، ۲۰۱۲ء، ص ۷۹

۱۱- ایضاً، ص ۸۰

۱۲- ایضاً، ص ۸۰

۱۳- ایضاً، ص ۸۰

۱۴- قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، مکتبہ الفہیم مئو ناتھ بھنجن، طبع دوم، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳٦

۱۵- قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، البلاغ پبلی کیشنز جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵، طبع دوم ۲۰۰۹ء، ص ۷۴۴

۱٦- شیخ وجیہ الدین اشرف، بحر زخار، مرکز تحقیقات فارسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، جلد اول، ص ۵٦۷

۱۷- دیار پورب میں علم اور علما، ص ۸۴۴

۱۸- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ص ۵۷

۱۹- تذکرہ علمائے اعظم گڑھ، ص ۸۱

۲۰- دیار پورب میں علم اور علما، ص ۴۵۷

۲۱- مولانا حبیب الرحمان اعظمی، تذکرہ علمائے اعظم گڑھ، مرکز دعوت وتحقیق، دیوبند سہارن پور، طبع دوم، ۲۰۱۲ء، ص ۸۲
۲۲- عبیدالرحمان صدیقی، تذکرہ مشائخ غازی پور، انیس پبلی کیشنز، صمد منزل مچھر ہٹہ غازی پور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۲۳
۲۳- شیخ شمس الدین حیدری، مناقب غوثی، مملوکہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ص۱۹۱
۲۴- تذکرہ مشائخ غازی پور، ص ۴۲۵
۲۵- مولانا عبدالحئی حسنی، نزہۃ الخواطر، مکتبہ دار عرفات، رائے بریلی، ۱۹۹۲، جلد ۶ صفحہ ۲۲۵
۲۶- تذکرہ مشائخ غازی پور، ص ۴۲۶
۲۷- مناقب غوثی، ص ۲۷
۲۸- تذکرہ مشائخ غازی پور، ص ۴۲۴
۲۹- مناقب غوثی، ص ۱۹۸
۳۰- مناقب غوثی، ص ۲۷

◆ ◆ ◆

مکاتیب

مناقب غوثی میں شیخ شمس الدین حیدری نے باب ہفتم میں اپنے نام شیخ ابوالغوث گرم دیوان کے ۱۴ مکاتیب نقل کیے ہیں جن میں سے بیشتر احسان وتصوف اور صوفیا سے متعلق ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں تصوف وسلوک اور اصطلاحاتِ صوفیا سے متعلق بعض مباحث بڑے اہم اور معرکہ آرا ہیں، اہل تصوف کے بعض اشعار جو بہ ظاہر نظر شرک وکفر کی حد کو چھوتے نظر آتے ہیں، ان کی بڑی دل نشیں تشریح اور قابلِ قبول توجیہ ان خطوط میں ملتی ہے۔

مکاتیب کی اصل زبان فارسی ہے، فارسی متن نقل کرنے کی بجاے ہم نے مکاتیب کا ترجمہ کر دینا زیادہ مناسب سمجھا، تاکہ اس کا فائدہ بیش از بیش ہو سکے۔ ترجمے میں ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ رواں دواں اور سلیس وشگفتہ ترجمہ ہو، تاکہ پڑھنے والوں کو ترجمہ پن کا احساس نہ ہو، بلکہ طبع زاد تحریر کا گمان گزرے۔ بعض پیچیدہ مباحث اور اصطلاحات کے ترجمے میں ہمیں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، مگر بہ فضل خدا ہم نے ترجمے کی سلاست وروانی باقی رکھنے کی اپنی سی پوری کوشش کی۔ اس کوشش میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ باذوق قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

۱۱۳۶ھ میں شیخ ابوالغوث نے ایک سال کا اعتکاف کیا تھا جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ انھیں ایام میں شیخ شمس الدین حیدری نے تحریری طور پر فارسی کے دو شعر کی تشریح چاہی تھی، جس کے جواب میں درج ذیل مکتوب شیخ ابوالغوث نے لکھا۔ وہ دونوں شعر یہ تھے:

من آں وقت بودم کہ آدم نبود
کہ آدم عدم بود حوا نہ بود

من آں وقت کردم خدا را سجود
کہ ذات و صفاتِ خدا ہم نہ بود

مکتوب اول

مکتوب بجانب دلہا حقائق آ گیں شیخ شمس الدین دام شوقہ وذوقہ
یہ فقیر کاتب حروف خیریت دارین کے لیے دعا گو ہے۔

خدا کی ذات نے [جو ایک حدیث کے مطابق کنزمخفی[۱] تھی] جب اپنے چہرے سے پردۂ جمال کو ہٹانے اور اپنی تمام صفات کو ظاہر کرنے اور اُس آئینے کے نظارے کا ارادہ فرمایا جو تمام غائب و حاضر کے اسما کا جامع تھا، تو اس کی ذاتِ احدیت کے نور میں جوش پیدا ہوا اور اس سے دو قسمیں نکلیں: ایک لطیف اور دوسری کثیف۔ قسم کثیف جامۂ کثافت میں ڈھل کر ایک الگ کیفیت کی حامل ہوئی جس کا نام 'نامی' ہے۔ چنانچہ وہ پہلی مرتبہ نور سے نار [آگ] ہوئی، دوسری مرتبہ نار سے باد [ہوا] ہوئی، تیسری مرتبہ باد سے آب [پانی] ہوئی، چوتھی مرتبہ آب سے خاک [مٹی] ہوئی اور پانچویں مرتبہ خاک سے رنگا رنگ انواع کا آئینہ دار انسان پیدا ہوا۔ اور جب وہ آئینہ بے جلا رہا تو نورِ لطیف جیسا کہ لطیف تھا ویسا ہی رہا اور وہ انسان کے جسم میں حلول کر کے روح کے نام سے موسوم ہوا۔ روح اور آئینہ کے جلا کی ترکیب سے عالم اجسام پیدا ہوا، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ 'ان اللہ خلق آدم علی صورتہ۔[۲] اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ جب انسان کی تخلیق مکمل ہوگئی تو خدا کی ذات متمکنِ نظارہ ہوگئی۔ گویا کہ انسان کی منزلت 'العین من العین' ہے۔ اب اگر انسان اپنی ذات کو پہچاننا چاہے یا معلوم کرنا چاہے کہ وہ کہاں سے آیا، کہاں گیا اور درمیان میں کیا ہوا؟ وہ کیا چیز ہے؟ اور کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ تو جیسا کہ اس نے مراتب سے نزول کیا اور تنزلاتِ عروج کو حاصل کیا، اوصاف بشری سے منزہ ہو کر اپنے ولولۂ شوق سے جس مقام و مرتبہ پر وہ عروج کرے گا، علم و مراتب کے ساتھ جو کچھ اس کو حاصل ہوگا، اس کا تکلم اپنی زبان سے کرے گا۔ تو گویا کہ انسان اللہ تعالی سے اپنے نفس کی معرفت حاصل کرتا

ہے اور حق تعالیٰ انسان سے اپنے اسما و صفات کو پہچانتا ہے: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ [۳] جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

پس حق تعالیٰ کی ذات انسان کا آئینہ ہے انسان کو اپنی ذات دیکھنے کے لیے اور انسان حق تعالیٰ کا آئینہ ہے حق تعالیٰ کو اسما اور اسما کے ظہور کو دیکھنے کے لیے۔ پس جس شخص کو اس کی معرفت حاصل ہوگئی، اس نے اس کے اظہار سے اپنی زبان بند کر لی اور بلبل کی طرح شاخِ لاہوت پر بیٹھ کر حال یکتائی میں ولولۂ ذوق کے ساتھ اس شعر کے ذریعہ رطب اللسان ہو گیا:

من آں وقت بودم کہ آدم نہ بود
کہ آدم عدم بود حوا نہ بود
من آں وقت کردم خدا را سجود
کہ ذات و صفاتِ خدا ہم نہ بود

لہٰذا کنتُ ولیا و آدم بین الماء والطین کا مطلب وہی ہے جو حدیث کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین [۴] کا ہے۔ جس شخص نے ان مقامات کا مشاہدہ کر لیا، اس کے لیے یہ علم عین حال ہے اور جو شخص ان منزلوں سے اجنبی ہے، اس کے نزدیک یہ محض قیل و قال ہے:

بس کن ز حدیث عشق بس کن
اے سوختہ ضبط! ایں نقش کن

مکتوب دوم

عزیز الوجود طالب صداقت قرین شیخ شمس الدین!

ذوق و شوق کے اضافے کے لیے دعا گو ہوں۔

جب عاشقوں [اہل اللہ] کا ذکر چھڑتا ہے تو جوشِ عشق نئی قوت سے شعلہ فشاں ہو جاتا ہے جو ہڈیوں کو پگھلانا شروع کر دیتا ہے اور روح وجد میں آ کر اعلیٰ علیین کی طرف جو کہ اس کا اصلی مقام ہے، پرواز کرنا چاہتی ہے، مگر جسم کا چند دنوں کا حصار جو روح کو پابندِ سلاسل کیے ہوئے ہے،

اسے خاک دانِ دنیا سے وابستہ رکھتا ہے اور وہ آیت کریمہ ان من شئی الا یسبح بحمدہ [۵] کے بموجب انا للہ وانا الیہ راجعون کی نغمہ سرائی میں مست رہتی ہے۔

اس قدر سوز وگداز اور اغیارِ غیریت کے باوجود ذکر یار زبان پر بے اختیار آتا ہے، حالاں کہ غیر وغیریت کا تعلق عالم صحو سے ہے، عالم محو میں اس کا اختیار باقی نہیں رہتا ہے، عالم محو میں تو غیر اور غیریت کا دخل سرے سے نہیں ہوسکتا:

اگر کافر ز بت آگاہ گشتے
چرا در دینِ خود گمراہ گشتے

کئی مرتبہ آں عزیز الوجود نے عاشق سرمست و ہوشیار حضرت شیخ فرید عطار کے مذکورہ شعر کی شرح کی درخواست کی ہے، مگر ہر مرتبہ فقیر نے تغافل سے کام لیا۔ کیوں کہ عاشقوں کے کلام پر اس وقت تک بات کرنا مناسب نہیں ہے جب تک کہ بات کرنے والا متکلم کے مرتبہ تک نہ پہنچ جائے۔ آج چار شعبان المعظم ہے، آج پھر شرح کی درخواست آئی ہے، اگر چہ طاعت کے مشاغل میں شرح اور حکایت بیان کرنے کی فرصت نہیں ملتی مگر پاس خاطر بھی ضروری ہے۔

حضرت الوجود یعنی ذات مطلق کے بے شمار مراتب ہیں، ان میں سے سات مراتبِ کلی ہیں:

۱-احدیت: یعنی مراتبِ ذات من حیث الذات کما ہو، نفی واثباتِ صفات کی طرف نظر کیے بغیر، بلکہ اس مرتبہ میں کسی بھی اعتبار ولحاظ کا دخل نہیں ہے، صرف ذات من حیث ہو ہو۔

۲-مرتبہ وحدت: یعنی مرتبہ ذات تمام چیزوں کی قابلیتِ محض کے اعتبار سے۔

۳-مرتبہ واحدیت: یعنی مرتبہ ذات علمِ ذات وصفات کے اعتبار تمام اشیا کی قابلیت کے ساتھ۔

۴-مرتبہ ارواح: یعنی مرتبہ ذات ظہورِ نور کے اعتبار سے، اگر چہ اس ظہور میں شکل وصورت نہیں ہے، مگر یہ ظہور اول ہے۔

۵-مرتبہ عالم مثال: یعنی مرتبہ ذات اشیاے مرکبہ مختلفہ لطیفہ کے اعتبار سے۔

۶-مرتبہ عالم اجسام: یعنی مرتبہ ذات اشیاے مرکبہ مختلفہ کثیفہ کے ظہور کے اعتبار سے۔

۷-مرتبہ انسان: یعنی مرتبہ ذات انواعِ متفقہ کے ظہور کے اعتبار سے جو تمام مراتب کا جامع ہے۔

اگر ان ساتوں مراتب اور ان کی نسبتِ معانی کی شرح کروں تو بات لمبی ہو جائے گی اور مشاغلِ طاعت میں خلل انداز ہوگی، اس لیے مختصراً لکھا جاتا ہے:

انسان اگر چہ بہ ظاہر ذات مطلق کے تمام مراتب میں سب سے بعید اور فروتر ہے، مگر حقیقت میں وہ ذات مطلق کے یہاں سب سے اعلیٰ اور اقرب ہے۔ اس کو اس طرح سے سمجھو کہ درخت کے بیج کے اندر تمام شاخ و برگ کے ظہور کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بیج بونے کے بعد سب سے پہلے سنبل کا ظہور ہوتا ہے، اس کے بعد پودا، اس کے بعد شاخ اور پتے، اس کے بعد پھول اور پھر اس کے بعد پھل آتا ہے۔ تو پھل بیج کا سب سے آخری ظہور ہے جو اگر چہ دیکھنے میں بیج سے سب سے دور ہے، مگر حقیقت میں وہ سب سے قریب ہے بلکہ بیج بونے کا مقصد ہی وہی ہے۔ پس انسان کامل بھی عالم اجسام میں پھل کے مانند ہے۔ صوفیہ کی اصطلاح میں انسان کو برزخ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ وجوب و امکان دونوں نسبتوں کا حامل ہوتا ہے، اگر چہ امکان کی نسبت غالب اور زیادہ ہوتی مگر کل شئی یرجع الی اصلہ کے قاعدے سے وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا۔ عاشقوں کی اصطلاح میں اس کو ''قرب'' کہتے ہیں اور قرب دو طرح کا ہوتا ہے:

ایک قربِ فرائض کہ بندہ کی ذات وصفات اللہ کی ذات وصفات میں اس طرح محو ہو جائے کہ بندہ آلہ ہو جائے اور حق تعالیٰ فاعل، جیسا کہ کلام الٰہی: وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی [۶] اس قرب پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرا قربِ نوافل ہے کہ انسان کی صفات اللہ تعالیٰ کی صفات میں اس طرح محو ہو جائے کہ حق تعالیٰ آلہ ہو جائیں اور بندہ فاعل، جیسا کہ حدیث قدسی: اذ یتقرب العبد الیّ بالنوافل کنتُ سمعہ و بصرہ الخ [۷] اس کی دلیل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ رئیس مستاں شیخ فرید الدین عطار صفاتِ بشریت میں محو ہو کر ارواح، اجسام اور انسان کے مراتب سے واحدیت، وحدت اور احدیت کے مرتبہ پر پہنچ کر قربِ نوافل میں جذب ہو گئے اور اذا تم الفقر فہو اللہ کے بموجب گویا کہ حق تعالیٰ کی زبان سے نغمہ سنج

ہوئے:

من خدایم من خدایم من خدا
فارغم از کبر و کینہ و از ہوا

اس میں لفظِ خدا کا تین مرتبہ تکرار مرتبہ احدیت، وحدت اور واحدیت کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن جس شخص نے ان مراتب کا مشاہدہ نہیں کیا ہے، اس کے لیے یہ شرح و بیان محض حرف و صوت ہیں۔ سنا ہوا دیکھے ہوئے کے مانند کیسے ہوسکتا ہے؟ انسان کو چاہیے کہ خود مشاہدہ کرنے کی کوشش کرے، صرف دوسروں کے بیان پر اکتفا نہ کرے:

گِردِ نام پدر چہ می گردی
پدر خویش باش گر مردی

ہیہات ہیہات! اس زمانۂ ناگفتہ و نانوشتہ میں میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیا لکھ رہا ہوں؟ اس عالم ظاہری کی مہاجرت کی صعوبت پر جو بھی لکھیں، کم ہے:

کے دہد دست ایں غرض یا رب کہ ہمہ مستاں شوند
خاطر مجموعِ ما زلف پریشان شما

حق تعالی اپنے فضل سے جلد ہی درمیان سے مفارقت کے پردے کو ہٹا دے گا اور اپنے احسان و کرم سے دوبدو ملاقات کی مسرت عطا فرمائے گا:

اے وصلِ تو اصل شادمانی
دائم بمراد دل بمانی

انسان کو چاہیے کہ یادِ الٰہی میں مشغول رہے اور کارِ عشق کو روز بہ روز ترقی دیتا رہے، تمام وظائف و اشغال کو پورا کرے اور اینما تولوا فثم وجہ اللہ[۸] کے بموجب حق تعالی کی ذات کے مراقبہ اور مشاہدہ سے محظوظ ہوتا رہے۔ صوم و صلوۃ، ذکر و فکر اور اکل و شرب سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق صرف اللہ کی عبادت کی نیت سے کرے، نہ کہ صحت، شہوت، شہرت یا نفسِ امارہ کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے، پوری رات بے دار رہ کر تہجد، نوافل اور صلوۃ عشق جو کہ آئینہ دل کو صیقل کرنے والی ہے، ادا کرے اور تلاوت قرآن میں کبھی ناغہ نہ کرے۔ غرض

سالک جتنا زیادہ مجاہدہ اور ریاضت کرے گا، اتنا ہی اس کا وقت کارآمد ہوگا۔ ہر حال میں اللہ سے راضی و شاکر اور اس کی مرضیات سے خوش رہے، کوئی ملال یا کبیدگی دل میں نہ پیدا ہونے دے، ہر قدم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرے، مخلوق سے لالچ اور توقع نہ رکھے، کیوں کہ مخلوق سے نہ کچھ ہوا ہے، نہ کچھ ہو رہا ہے اور نہ کچھ ہوگا، جو کچھ ہے، اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ دے گا حق تعالی ہی دے گا، بندوں کے افعال درمیان میں محض وہم اور واہمہ ہیں۔ لہٰذا جو کچھ مانگنا ہو اللہ سے مانگے اور جو کچھ کرے اللہ کے لیے کرے، خاندان، رشتہ دار، دوست و احباب اور دشمن سے عار نہ کرے اور نہ ان سے کسی طرح کی لالچ و توقع رکھے۔ قرآن کی آیت ان اللہ یفعل مایرید [۹] کو ہمہ وقت مستحضر رکھے۔ آخرت کے راستے کا توشہ اور نقد لے کر روز و شب راستہ طے کرتا رہے اور مزید کی کوشش میں لگا رہے۔

ہر شخص کو اپنے کام کا حساب دینا ہے۔ حق تعالی نے دن میں بارہ ہزار سانس کی نعمت ہر انسان کو عطا کی، اگر وہ آتی جاتی رہے تو زندگی چلتی رہے، اور رات میں بارہ ہزار سانس کی نعمت دی ہے۔ کل ملا کر چوبیس ہزار سانسیں ہوئیں جو ہر روز انسان کے وجود میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ سالکِ صادق اور طالبِ صادق کو ایک لمحہ کے لیے غافل نہیں ہونا چاہیے، ہر سانس کے ساتھ دو مرتبہ اللہ تعالی کا شکر ادا کرنا چاہیے، کم از کم وقت متعین کر کے چوبیس ہزار مرتبہ اسم ذات کا ورد کرنا چاہیے، اس عمل میں چار سے چھ گھنٹے لگیں گے، لیکن اگر کسی نے یہ کر لیا تو گویا کہ اس نے پورے وقت کی حفاظت کر لی، ایک لمحہ بھی غفلت میں نہیں گزارا۔ صوفیہ ایک سانس میں دو عید کرتے ہیں۔

ہیہات ہیہات! عشق الٰہی کے حقائق کو لکھا یا بیان نہیں کیا جا سکتا، بارہا طبیعت نے چاہا کہ اسرار الٰہی کے لامتناہی دریا کی شناوری کر کے لکھوں، لیکن قلم جل کر ٹوٹ گیا اور دوات خشک ہوگئی:

افشاے رازِ خلوتیاں خواست کرد شمع
شکر خدا کہ سر دلش بر زباں گرفت

افسوس صد افسوس، میں کہاں ہوں اور میرا دوست کہاں ہے؟ اے فلک! یہ کیسا قانون ہے؟ جامع المتفرقین جلد ہی کوئی ایسی صورت پیدا فرمائے گا کہ درمیان سے مفارقت کا پردہ ہٹ

جائے اور جو پہلے سے طے شدہ ہے وہ ظاہر ہو جائے۔ یہ ایسا علم ہے کہ جسے نہ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ لکھا جا سکتا ہے بلکہ یہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے:

کل ما یتمنی المرء یدرکہ
تجری الریاح بما لاتشتہی السفن

اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ جلد جسمانی ملاقات ہو تو اس کو عشق کی آگ اور تیز کر دینی چاہیے:

نے شعلہ سر کشیدہ نہ دودم ہوا گرفت
ہر جا کہ سوختم غریبانہ سوختم

غرض پختہ یقین ہے کہ جلد ہی اس وحیدِ کاشفِ اسرارِ لایزال، فریدِ خازنِ نکتہ ہائے ہاتفِ استار ایزد متعال، غواصِ بحرِ حقیقت، دُرِ دریائے حقیقت، غنی الحال، مغنی المقال کی زیارت و وصال کا شرف حاصل ہوگا:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

سلکم اللہ تعالی الی یوم الدین وایدکم الی سبیل المومنین۔ آمین یا رب العالمین

مکتوبِ سوم

الحمد للہ لمن کان کنزاً مخفیاً فاحب لظہور ذاتہ فی اعیان صفاتہ فخلقنا۔ شاہدِ حقیقی حجرۂ احدیت میں تھا کہ آتش عشق نے شعلہ پکڑا اور درمیان سے حجاب کو اٹھا دیا، جمال معشوق اس کی نگاہ میں اتنا بھایا کہ صحرا کا رخ کیا، پھر حجرے کی طرف مائل نہیں ہوا۔ اب ہماری آزمایش کے لیے اس کا جلوہ ہر چہار سو بکھرا ہوا ہے۔ انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوما جہولا [۱۰]۔ یہ آیت محب عاشق کے لیے گوشمالی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ طالب کی طرح سالک آناً فاناً اپنی خودی چھوڑ کر مقصود میں ایسا مشغول

ہوجائے کہ کفر و ایمان کی کچھ خبر نہ رہے، مشیخیت کی شہرت اور انانیت، کشف و کرامت کی حالت اور اس جیسے تمام نفسانی لذائذ جو صراط مستقیم کے لیے حجاب و مانع ہیں، سالک اس طرح کے سارے چھوٹے بڑے خیال سے باز آجائے اور عجز و نامرادی کے طریق کو اپنا شعار بنائے، خدا کے ذکر وفکر سے قوت حاصل کرے، جیسے بھوکا اور پیاسا بغیر کھائے اور پیے سکون نہیں پاتا، جیسے بھی ممکن ہو، خواہ کوئی اس کو اچھا کہے یا برا کہے، جب تک سیر نہیں ہوجاتا، کھانے اور پانی کو نہیں چھوڑتا۔ عاشق صادق کو بھی چاہیے کہ اسی طرح اللہ کے ذکر وفکر سے سیر نہ ہو، ہر وقت بے قرار رہے اور اس کو حاصل کرنے میں کسی سے کوئی خوف نہ رکھے، بلکہ شکریے کے ساتھ ہل من مزید کا نعرہ لگاتے ہوئے مزید کی طلب وطمع میں رہے۔

ادبِ سلوک کی شرط یہ ہے کہ بیوی، بچے، خویش واقارب، حبِ جاہ، پیری اور ماسوا اللہ کے تمام خیال کو دل سے نکال دے اور جو علم مرشد مُجاز کی طرف سے حاصل ہو، پورے اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کرنے کی سعیِ بلیغ کرے اور باقی ہر چیز اور ہر شخص سے بے گانہ ہوجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کی ایک حدیث یہی معنی بیان کرتی ہے: الدنیا کلہا ظلمۃ الا العلم، والعلم کلہا ظلمۃ الا العمل، والعمل کلہا ظلمۃ الا الاخلاص[11]۔ جب تک عمل میں اخلاص پیدا نہ ہو، انسان اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اخلاص کی شرط یہ نہیں ہے کہ مرشد کے حکم کی خلاف ورزی کرے اور ایسا عمل کرے جو اس کے شایانِ شان نہ ہو، اور مرشد کے حکم سے غفلت برتے اور اسے چھوڑ دے اور حیلہ وعذر کرے کہ ہم سے محنت نہیں ہو پاتی۔ مرشد کا کام رہنمائی کرنا ہے اور طالب کا اس پر عمل کرنا فرض ہے۔ اگر فقرا کے افعالِ ظاہری پر سجادگی اور مخدوم زادگی کا انکار کرنے لگے تو اس کا علاج نہیں ہے۔ شاید کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونی اور خواجہ معین الحق والدین حسن سنجری قدس سرہما کا قصہ سنا ہو۔ اب غفلت ترک کر کے جن وظائف و اشغال کی تلقین مرشد کی طرف سے ہوئی ہے، ان کو ادا کرنا چاہیے اور کسی کے جبہ ودستار اور اشتہار ظاہری سے فریب نہیں کھانا چاہیے:

ترکِ شہوت گیر تا سلطاں شوی

شہوت صرف عورتوں کے ساتھ اختلاط کا نام نہیں ہے، بلکہ ہر نفسانی لذت جیسے حبِ شہرت، بزرگی، صاحبِ جاہ، صاحبِ لفظ اور صاحبِ معانی خود کو کہنا یا کہلوانا یا اس غرض سے کسی

کی خدمت کرنا کہ اس سے میں چیزوں پر قادر ہوجاؤں گا، یہ سب شہوت ہے۔ جس شخص کو اللہ تعالی گوش وہوش عطا کرتے ہیں، اسے ان چیزوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور جو ان چیزوں سے بچا لیا گیا، اسے اللہ تعالی کا شکر ادا کرنا چاہیے، ان چیزوں پر غرور نہیں کرنا چاہیے بلکہ عاجزی و انکساری اختیار کرنی چاہیے، ہمیشہ ذکر وفکر میں مشغول رہنا چاہیے۔

اپنی عبادتوں کو کمتر سمجھے اور گناہوں کو زیادہ جانے اور ہر وقت اس کے فضل کا امیدوار رہے۔ اپنے گناہوں کو شمار سے باہر سمجھے اور اطاعت کو قلیل سمجھے۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا رہے کہ 'خداوندا! تو نے مجھے بے شمار نعمتوں سے نوازا، مگر میں ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کرسکتا، تیرے رحم وکرم سے امیدوار ہوں کہ تو اپنے کرم کو دیکھے گا، میرے کردار کو نہیں۔ خاکی اور ذرۂ بے مقدار سے کیا ہوسکتا ہے کہ وہ تیری بندگی کا حق ادا کر سکے۔

ہر ساعت اور ہر لحظہ اسی طرح اس کی یاد میں مشغول رہنا چاہیے، شاید کریمِ کارساز اپنی مہربانی اپنے بندے پر نازل فرمادے، ورنہ ہم لوگوں کا عمل ایسا ہے کہ اس پر بس افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

مکتوب چہارم

عزیز دلہا! سلامت

عنایت نامہ ملا اور اس کے مضمون سے واقفیت ہوئی، اس میں قوت و استقامت کے لیے بہ تکرار لکھا ہے تو سنو!

جناب ایزد سبحانہ جل شانہ واعظم سلطانہ وعم غفرانہ واکبر عرفانہ واکثر فیضانہ سے نامراد اور دل تنگ نہیں ہونا چاہیے۔ مردود وہ ہوتا ہے جو دنیا کی تھوڑی سی محنت اور شدت سے جو اس بزرگ کارساز کی شان میں ایک ذرہ کے مانند ہے، وحشت واضطراب کا شکار نہ ہو، ہر وقت اس کی بارگاہِ عالی سے امیدوار رہنا چاہیے کہ اِن محنتوں کا صلہ اُس عالم باقی میں ہزار در ہزار درجہ کی صورت میں ملے گا۔ جس وقت عارف اس دنیاے فانی میں تکلیف، رنج، فاقہ، ضعف اور ناتوانی کو برداشت

کرتا ہے، عشقِ خدا میں سرمست ان میں سے کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا، بلکہ لحہ بہ لحہ عشق میں ڈوب کر ہل من مزید کا نعرہ بلند کرتا ہے اور مردانہ وار پوری کوشش کے ساتھ عبادت میں منہمک رہتا ہے تو اللہ تعالی ملائکہ کو جمع کر کے فرماتے ہیں کہ 'اے فرشتو! تم سب میرے عاشق کو دیکھو، میں نے اس کو رنج دیا، مگر وہ خاطر میں نہیں لایا اور مسلسل میری عبادت میں لگا رہا۔ مجھے عرش و کرسی کی قسم ہے کہ میں نے اس بندے کو قبول کر لیا اور اسے دوست بنا لیا ہے۔ تم لوگ جاؤ اور میرے اس دوست کے لیے عالم آخرت میں ہزاروں محل اور بلند مراتب و درجات کا انتظام کرو، اس بندے نے میرے لیے عالم فانی کو چھوڑا ہے تو میں اس کو عالم باقی میں بلند درجات سے نوازوں گا۔'

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیاے فانی کو 'حقیر' اور 'نجس دنیا' کہا ہے، تمام اولیا نے اس کو ترک کیا ہے، اگر تھوڑا سا بھی ان کو دنیا کا سامان میسر آ جاتا تو ہزار عجز و زاری کرتے اور توبہ کرتے، راتوں میں بے دار رہتے اور مناجات کرتے کہ 'الٰہی! مجھ سے کون سا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ مجھے دربار سے باہر کر کے دنیا کے اسباب میں مشغول کر دیا گیا ہے، دنیا کی طرف سے مجھے غافل کر دے اور اپنی طرف متوجہ کر لے۔'

حق تعالی کے فضل پر راضی و شاکر رہنا استقامت ہے، تھوڑا سا بھی کسی اعتبار سے تنگ دل اور مضطرب نہیں ہونا چاہیے، ہمیشہ اور ہر حال میں اس کا شکر بجالانا چاہیے۔ حق تعالی کی طرف سے جو رنج تمھارے حق میں مقدر ہے، اسے بھی راحت و نعمت سمجھ کر اس پر شکر بجالانا چاہیے، کیوں کہ دین اور بڑے مقاصد کے راستے اسی طرح کھلتے ہیں۔ پہلے کے تمام اولیا نے دنیاے دنی کو ترک کیا ہے، کسی نے طلب نہیں کیا ہے۔ ولیِ عاشق کی علامت یہ ہے کہ اگر دنیا اس کے سامنے آئے تو وہ اس سے تیر کی طرح بھاگے، اسے ترک کرے، نہ کہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگے۔ اور طلب کا تعلق بہر حال ذوق و شوق سے ہے۔ ہر حال میں اس سے راضی و شاکر رہنا چاہیے:

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در سراے ما

مکتوب پنجم

محب جانی! سلامت

عاشق کا کام یہ ہے کہ آناًفاناً مولی کی طلب میں لگ جائے اور خویش و بے گانہ سب سے علاحدہ ہو جائے اور اگر کبھی جماعت کے ساتھ ہو تو بھی مطلوب کے حصول میں جماعت کے لوگوں سے حیا نہ کرے، ان کو بھی خدا کی طرف متوجہ کرے، مشیخیت بگھارنے میں نہ لگا رہے۔ خدا کی رضا کو اپنی فلاح سمجھے اور کسی سے کوئی خوف نہ رکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے اور بزرگان سلف کی طرح اس دنیا میں مسافر کی طرح رہے اور دوسرے مسافروں سے کسی طرح کی لالچ اور توقع نہ رکھے، خواہ برہنہ سر و برہنہ پا ہو یا پیدل ہو یا بھوکا ہو، مقصد قطعِ مسافت ہو، دھیان راستے پر ہو اور منزل پر پہنچنے کی کوشش ہو۔ کیوں کہ کسی کی مضرت و منفعت سے اسے کوئی کام نہیں ہے۔ چوں کہ دوسرے مسافروں سے ملاقات محض ایک لحظہ کی ہے، اس لیے اس ایک لحظہ میں کسی سے دل نہ لگائے ورنہ راستہ کھوٹا ہو جائے گا۔

دنیا کی زندگی ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہے اور اس میں کوئی معین و مددگار بھی نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن حجرے میں بوریا پر لیٹے ہوئے تھے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دیکھا کہ بوریا کا نقش آپ کے جسم مبارک پر آ گیا ہے۔ عرض کیا کہ اگر آپ حکم دیں تو ہم لوگ اپنی چادر بچھا دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'میری زندگی اس دنیائے فانی میں اس مسافر کی طرح ہے جو کسی درخت کے سائے میں آیا، آرام کیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔'[۱۲] لہٰذا اس ایک لمحے کے آرام کے لیے بستر کی ضرورت نہیں ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی عالی مرتبت ذات نے اپنی دنیا کی زندگی کو اس قدر کم تر شمار کیا ہے تو ہم لوگ جو اُن کے سامنے ارذل ترین ہیں، رذالت کے اعتبار سے اپنی دنیا کی زندگی کے بارے میں ہم سوچ سکتے ہیں کہ وہ کس قدر کم تر ہونی چاہیے؟

خدا کی یاد جو کہ مقصود اعظم ہے، اس میں مصروف رہے اور مسافر کی طرح بے گانہ وار ہر ایک کے سامنے سے گزر جائے اور ہر وقت اپنی توجہ منزل پر مرکوز رکھے، نہ کہ عام لوگوں کی طرح

گپ شپ، افسانہ خوانی اور لعن طعن کو شعار بنائے اور اسی میں مصروف رہے۔ اگر فرعون جنتی ہوجائے اور یزید لعنتی ہوجائے تو اس سے تم کو کیا لینا دینا، اپنے کام میں لگے رہو، داستان سرائی چھوڑو، کیوں کہ مقصود منزل پر پہنچنا ہے، نہ کہ بیچ راستے میں ضلالت کی کھائیوں میں گمراہ ہونا ہے۔

بس اتنا کافی ہے، سمجھنے والے سمجھ گئے۔ السلام علی من اتبع الہدی

مکتوب ششم

جانِ من، ایمانِ من! سنو

وہ ذات جس کو ذات مطلق اور حق واحد کہتے ہیں، اس نے جب عدم پر اپنا فیض برسایا تو کائناتِ امکان یعنی آدم اور پوری دنیا کا وجود ہوا۔ گویا کہ آدم نام ہے عدم کا اور اِلٰہ نام ہے اس فیضان کا جو ہر وقت برستا رہتا ہے اور عدم اسی فیضان سے ساعت فساعت بلکہ ہر لمحہ کسب کر کے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ عدم ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ بچہ سے بالغ ہوتا ہے، بالغ سے جوان ہوتا ہے، جوان سے ادھیڑ ہوتا ہے اور ادھیڑ سے بوڑھا ہوجاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ عدم پر لاکھوں بلکہ کروڑوں فیض الٰہی کا نزول ہوتا ہے، جیسے چراغ کا شعلہ ہر وقت تیل اور فتیلے کی مدد سے تبدیل ہوتا رہتا ہے مگر بظاہر دیکھنے میں ایک ہی شعلہ نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں چراغ کے تیل کے فیض سے ایک رات میں ہزاروں لاکھوں شعلے پیدا ہوتے ہیں، کیوں کہ اگر تیل نہ ہوتو چراغ محض عدم اور ناچیز ہے۔ اسی طرح انسان اصل میں عدم ہے اور یہ عدم فیض الٰہی سے قائم ہے۔ کیوں کہ ہر ساعت اس پر اللہ کا فیض طاری ہوتا رہتا ہے، اگر چہ دیکھنے میں ایک انسان پوری عمر ایک ہی نظر آتا ہے۔ جیسے کسی کا نام زید ہوتو وہ زید بچپن سے بڑھاپے تک بظاہر دیکھنے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی شکل وصورت پر قائم ہے، لیکن حقیقت میں وہ زید ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے، کیوں کہ اس پر فیض الٰہی ہر لمحہ آناً فاناً طاری ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کو بچپن میں دیکھے اور پھر طویل مدت کے بعد بڑھاپے یا جوانی میں دیکھے تو اس کو پہچان نہیں سکے گا، اس لیے کہ اس کی شکل وصورت تبدیل ہوچکی ہوگی۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ ہر لمحہ اللہ کا فیض انسان اور دنیا کی دوسری اشیا مثلاً حیوانات، اشجار وغیرہ پر طاری ہوتا رہتا ہے۔ اور عدم اپنی حیثیت کے اعتبار سے صرف عدم ہوتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تو پھر سنو! صوفیہ کی اصطلاح میں فیض الٰہی کو اللہ کہتے ہیں اور عدم کو آدم کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے فیض کثیر ہو گیا اور آدم جو کہ نام ہے عدم کا، وہ واحد رہا۔ لہٰذا 'اللہ لکھ و آدم یک' کہنا صحیح ہے، اس سے مغالطہ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اور اسی قیاس پر 'محمد ہزار' کا اضافہ بھی ہے۔ اس لیے پہلے اللہ ہے، اس کے بعد محمد، پس محمد کے درجے میں کچھ کمی آ جائے گی۔ یعنی عدم پر اللہ کا فیض ہر لمحہ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض اس کے مقابلہ میں ذرا تاخیر سے ہے۔ گویا کہ فیضِ محمدی ایک دن میں متعدد بار ہوتا ہے اور فیض الٰہی پورے دن برستا رہتا ہے۔ لہٰذا فیضِ محمدی فیضِ الٰہی کے مقابلہ میں کم ہو گیا۔ پس 'اللہ لکھ، محمد ہزار، آدم یک' کہنا صحیح ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے فرمایا ہے:

بیزارم ازاں کنہ خدائی کہ تو داری
ہر لحظہ مرا تازہ خدائے دگر است

سمجھنے والوں نے سمجھ لیا۔

ہجرت کے دنوں کی شکایت جتنی لکھی جائے، کم ہے:

فواللہ ما فارقتکم قالیاً لکم
و لکن ما یقضی فسوف یکون

حق تعالیٰ سبحانہ فیض صحبت سے روکنے والے رقیبوں کو اپنے قہر سے ہمیشہ کے لیے دفع اور معدوم کر دیتے ہیں:

ز رشک مدعی دادم قرار دوری از بزمت
فریب بخت بد را نام غیرت کردم و رفتم

بہت سی آرزوئیں مجیب الدعوات حقیقی کے سامنے پیش نہیں کیں کہ وہ اپنے عمومی فیض سے راز اور رمز کے درمیان سے مفارقت کا پردہ ہٹا دے گا:

مہتاب رخت ندیدم آخر

صد صبح اگر چہ شام کردم
خود را بہ سگ تو نام کردم
چوں سگ بدرت مقام کردم
ہر نامہ کہ من بتو نوشتم
از خون جگر تمام کردم

ہر چند کہ وہ اپنے حقائق کلی سے آگاہ کرنا چاہتا ہے، لیکن قلوب کے راز کو قلوب کے ساتھ پوشیدہ رکھنا بھی اس کے ضابطہ میں سے ہے، اس لیے اسے لکھا نہیں جا سکتا:

درمیان راز مشتاقاں قلم نامحرم است
وز مقامے حرف می گویم کہ دم نامحرم است

چنانچہ اس راہ کا سالک معنی کے اظہار سے بے پردہ ہو جاتا ہے:

کسے است محرم کہ من بدستش بتو فریسم سلام خود را
کسے نہ بینم کہ گوش دارد سخن غریباں مگر صبا را

اور گنہ گار پُر امید بندہ اس معنی کی تمنا کرنے لگتا ہے:

بر اے صبا! پیامے بگل از زبان بلبل
فان سئلت حالی فکما رأیتنی قل

بہر کیف! شکایت مختصر کر کے مدعا کی طرف آتے ہیں۔ جس وقت سالک مرتبہ ورد سے جو کہ ہر مبتدی کے لیے لازم ہے، ذکر میں مشغول ہوتا ہے، جب وہ اس مرتبہ میں پختہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنے قلب کے ذریعے باطن میں رجوع کر کے اللہ کے تصور کے بعد رنگ سرخ سے کمال استحضار حاصل کر لیتا ہے۔ پھر اللہ کے الف کو محو کر دیتا ہے اور 'للہ' باقی رہتا ہے، پھر مزید ترقی کر کے 'للہ' کے پہلے لام کو بھی محو کر دیتا ہے اور صرف 'لہٗ' باقی رہتا ہے، پھر دوسرے لام کی بھی نفی کر کے صرف 'ہٗ' کا تصور کرتا ہے، جسے چودہویں کے چاند سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر چاند کی بھی نفی کر کے اس کے نور کا تصور باقی رکھتا ہے، پھر اس نور سے عروج کر کے نور کا تصور دھویں کے رنگ میں کرتا اور یہ تصور ایک مدت تک باقی رہتا ہے، پھر اس رنگ کو ترک کر کے سرخ رنگ کا تصور ایک مدت

تک کرتا ہے، پھر اس سے عروج کر کے زرد رنگ کے تصور پر آ جاتا ہے، پھر اسے بھی ترک کر کے ایک عرصہ تک سیاہ رنگ کا تصور کرتا ہے۔ سیاہ رنگ کے تصور کو ترک کرنے کے بعد اس کا تصور بے رنگ ہو جاتا ہے۔

ان تمام مقامات کو طے کرنے کے بعد سالک تفکرات میں مشغول ہو جاتا ہے۔ پہلا تفکر یہ ہوتا ہے کہ نفس کے تمام قبائح و نقائص کو اپنے سے دور کر کے صلاح و پاکیزگی حاصل کر لے۔ سالک کا یہ تفکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: تفکر ساعة خیر من عبادة سنة[۱۳]۔ دوسرا تفکر یہ ہوتا ہے کہ دنیا فانی ہے، اس کو بقا حاصل نہیں ہے، بلکہ ماسوی اللہ تمام چیز فانی ہے، صرف اللہ کی ذات باقی ہے، لہٰذا دل کو فانی سے ہٹا کر باقی سے لگانا چاہیے۔ اور یہ تفکر چھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تفکر ساعة خیر من ستة سنین[۱۴]۔ تیسرا تفکر یہ ہے کہ معبود و مقصود اور موجودِ حقیقی صرف ایک ہے۔ یہ تفکر جن و انس اور تمام مخلوقات کی عبادت سے بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: تفکر ساعة خیر من عبادة الثقلین[۱۵]۔

جتنا تفکر میں ڈوبے گا، مشاہدۂ مذکور اسے حاصل ہوتا جائے گا، اور جب مشاہدہ حاصل ہو جائے گا تو:

ورد کن ذکر و فکر بعد حضور
پس بتوحید حق شوی معمور

اتنی کوشش کرے کہ توحید حاصل ہو جائے، توحید حاصل ہونے کے بعد وہ عین ہو جائے گا۔

مزید سالک کو یہ بھی کوشش کرنی چاہیے کہ اپنا قبلہ معلوم کر لے، تا کہ مومن معصوم ہو جائے۔ اہل شرع کا قبلہ مکہ معظّمہ ہے، اہل طریقت کا قبلہ دل ہے، اہل حقیقت کا قبلہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اہل معرفت کا قبلہ اپنی ذات کا فنا اور اللہ کی ذات کا بقا ہے۔ لہٰذا سالک کو چاہیے کہ ابتدا میں عبادت شریعت کے مطابق کرے، اس کے بعد شریعت کے ساتھ طریقت کے مطابق کرے، اس کے بعد شریعت کے ساتھ معرفت کے مطابق کرے، تا کہ عارفِ کامل ہو جائے،

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فولّ وجھک شطر المسجد الحرام [۱۶]۔ یعنی نماز کے وقت چہرہ مسجدِ حرام [خانہ کعبہ] کی طرف کرو۔ یعنی اہل شرع مکہ کی طرف، اہل طریقت دل کی طرف اور اہل حقیقت ذاتِ حق کی طرف چہرہ کرتے ہیں۔

اسی طرح اہل شریعت کی نمازِ پنج گانہ مخصوص ارکان یعنی قیام وقعود وغیرہ کی ادائیگی ہے، اہل طریقت کی نماز دائمی ذکرِ دل ہے کہ اس سے ایک لمحہ کے لیے غافل رہنا گناہ ہے اور اہل حقیقت کی نماز ذاتِ حق میں اس طرح محو ہونا ہے کہ تمام چیزوں کو ترک وفراموش کردے، یہاں تک کہ اپنی ذات کو بھی فراموش کردے۔ پس عبادتِ شریعت: نماز، روزہ، بیع وشرا، نکاح وغیرہ ہے، عبادتِ طریقت عبادت شریعت کے ساتھ مرشد کے حکم کے مطابق اللہ کا ذکر ہے، عبادتِ حقیقت غیر اللہ سے دل کے تعلق کا منقطع ہوجانا، اللہ سے دل کا پیوست ہوجانا اور اس کے مشاہدہ کا حاصل ہوجانا ہے اور عبادتِ معرفت اپنی خودی کو ہر طرح سے مٹادینا اور فنا ہوکر بقاے حق کے ساتھ تحلیل ہوجانا ہے۔ جب معروفت حاصل ہوتی ہے تو سالک ان تمام مراتب کا جامع ہوجاتا ہے۔

عزیز من! دنیا کو ترک کرنا مبتدی سالک کا کام ہے، عقبیٰ کو ترک کرنا متوسط سالک کا کام ہے اور خود کو ترک کرنا منتہی سالک کا کام ہے۔ اور نئے سرے سے وجود میں آنا اور بقا پانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

عزیز من! سالک کو چاہیے کہ ابتدا میں عوام الناس کی صحبت سے احتراز کرے، لیکن اگر دینی یا دنیوی فائدہ کے لیے عوام کی صحبت ناگزیر ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے:

لقاء الناس لیس یفید شیئاً
سوی الهزمان من قیل و قال
فاقلل من لقاء الناس الا
لاخذ العلم و اصلاح الحال

نیتوں کے جاننے والے داناے حقیقی کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے سامنے اپنے دل کو ظاہر کرنا پڑے۔ مشہور ہے:

دل را بدل رہے ست دریں منزل سپہر

از سوے کینہ کینہ و از سوے مہر مہر

روبروملاقات کی آرزو اتنی ہے کہ اس کو تحریر میں بیان نہیں کیا جاسکتا:

خیال روے تو چوں بگذرد بگلشن چشم
دل از پے نظر آید بروں ز روزن چشم

محبت سامی نے بارہا جوش دلا کر آمادہ کیا کہ دوستِ یگانہ سے ملاقات کا قصد کروں، دو تین مرتبہ پختہ عزم بھی کیا مگر بعض موانع کی وجہ سے ارادہ موقوف کرنا پڑا:

تا در نہ رسد وعدہ ہر کار کہ ہست
سودے نکند یارے ہر یار کہ ہست

بہرکیف! اس نیازمند کو اپنے سے جدا نہ سمجھیے بلکہ ہمیشہ آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں:

خیال روے تو در ہر طریق ہمرہِ ما ست
نسیم سوے تو پیوند جاں آگہہ ما ست

مکتوب ہفتم

برادرم عدالت آگیں شیخ شمس الدین دام توفیقہ!

آپ کے علم میں ہوگا کہ جب حضرت حق جل مجدہ نے محبت ذاتی کے اقتضا سے جلوہ فرمایا تو تمام ممکنات کی استعداد کی تخلیق وتعیین کر کے علم ازلی کی فضا میں متمکن کردیا۔ اس کے بعد ممکنات نے اپنی استعداد کی زبان سے اللہ تعالی کے اسما سے وجود خارجی کی التجا و درخواست کی کہ ہم کب تک عدم کے قید خانے میں محبوس رہیں گے؟ اگر آپ کی توجہ سے ہم وجود کے نور سے منور ہوجائیں تو یہ آپ کے آثار کی ایک تحقیقی علامت ہوگی۔ حق تعالی کے اسما نے بات سن کر فرمایا کہ تم حق بجانب ہو، مگر ہم سب ''اسم قدیر'' کے حیطۂ تصرف میں ہیں، وہاں چل کر بات رکھتے ہیں۔ تمام اسما اسم قدیر کے پاس پہنچے اور ممکنات نے جو درخواست کی تھی، وہ بیان کی۔ اسم قدیر نے کہا کہ اسما اور ممکنات نے صحیح کہا ہے، لیکن ہم محکوم ہیں ''اسم مرید'' کے امر کے، اور ارادہ ''اسم علیم'' کے

حکم کے تحت ہے۔ لہٰذا سب اسم علیم کے پاس پہنچے اور مذکورہ درخواست دہرائی۔ اسم علیم نے کہا کہ ممکنات کے ایجاد کا وقت آ گیا ہے، آؤ! ہم سب اسم اللہ کے حضور چلیں۔ سب وہاں پہنچے اور زبانِ انکسار سے اپنا مدعا عرض کیا۔ اسم اللہ نے کہا کہ یہی حق ہے، مگر یہ حضرت مسمّی کا کام ہے۔ سب مسمّی کے حضور ادب سے حاضر ہوئے اور مذکورہ درخواست پیش کی۔ مسمّی نے اسما اور ممکنات کی درخواست کو سنا اور اپنے اسما کو ممکنات کے ساتھ کر دیا، اسما اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور دنیا ایسے خیر وخوبی سے وجود پذیر ہوگئی کہ اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن جب متضاد اسما کی خصوصیات کا ظہور ہونے لگا، جیسے ''اسم عفو''، ''اسم منتقم'' کے بر عکس ہے اور ''اسم لطیف''، ''اسم قہار'' کی ضد ہے، تو ایسی خصومت برپا ہوئی کہ گویا دنیا پھر سے معدوم ہو جائے گی۔ پھر سے ممکنات اسما کے حضور التجا لے کر پہنچے کہ ہم نے جامۂ وجود تو پہن لیا ہے مگر دنیا میں اس قدر تضاد اور خصومت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم یا تو معطل یا پھر معدوم ہو جائیں گے۔ پھر اسی مذکورہ ترتیب کے مطابق مسمّی کے حضور پہنچ کر التجا کی۔ حضرت مسمّی نے اسم ''حکم وعدل'' کو ان کے ساتھ کر دیا کہ اسے اپنا خلیفہ بنا لیں، یہ ممکنات کی خصومت کو ختم کر دے گا اور کسی کو اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس حاکم کے اندر عدل نہیں ہوتا ہے، اس کی حکومت بہت جلد زوال سے دوچار ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایجادِ عالم میں یہ حکمت ہے کہ رفعِ خصومت میں کسی کو اپنی حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اور یہ چیز بغیر عدل کے ممکن نہیں ہے۔

اللہ کا ہر اسم کلی اور جزئی دونوں ہے۔ کلی کا مظہر کلی ہے اور جزئی کا مظہر جزئی ہے۔ ہر حاکم اپنی حکومت کے بقدر اسم حکم کے تحت ایک اثر رکھتا ہے، اور اس دنیا میں ہر شخص کم از کم اپنی ذات کا حاکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کلکم راع و مسئول عن رعیته [۱۷] اس پر شاہد ہے۔ پس ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی حاکمیت کے بقدر عدالت سے کام لے اور اسم عدل کے فیضان سے مستفیض ہوتا رہے، تاکہ آخرت کے جواب سے عہدہ برآ ہو سکے اور اس کی حکومت مستقیم حکومت کے زمرے میں شمار ہو۔ ذالک فضل اللّٰہ یوتیه من یشاء

اور اللہ کے ہر نام کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے۔ ظاہر کا مظہر ظاہر ہوتا ہے اور باطن کا مظہر باطن ہوتا ہے۔ چنانچہ سلطان یا خلیفہ ظاہرِ کلی و جزئی ہر دو اعتبار سے اسم حکم کا ظاہری مظہر

ہیں اور خلیفۂ باطن یعنی قطب الاقطاب اور تمام رجال اللہ اسم حکم کا باطنی مظہر ہیں۔ کبھی ایک ہی شخص خلیفۂ ظاہر و باطن دونوں ہوتا ہے اور کبھی الگ الگ۔ لہٰذا واجب و لازم ہے کہ اسم مذکور کا مظہرِ باطن تمام امورِ ظاہر میں اسم مذکور کے مظہرِ ظاہر سے مدد حاصل کرے اور اس کا مطیع و فرماں بردار رہے اور اسمِ مذکور کا مظہرِ ظاہر تمام امورِ باطن میں اسم مذکور کے مظہرِ باطن سے مدد حاصل کرے اور اس سے تجاوز نہ کرے، تا کہ امور ظاہری و باطنی دونوں بخیر وخوبی انجام پاتے رہیں۔ اللہ کا قول ہے: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم [۱۸] (ای اولی الظاہری والباطنی) ۔ واللہ یقول الحق وہو یہدی السبیل [۱۹]

مکتوب ہشتم

برادرم شیخ شمس الدین کو حق الیقین کی دائمی تحقیق حاصل ہو، نہ کہ عین الیقین یا علم الیقین کی۔ کیوں کہ عالم کو علم الیقین حاصل ہوتا ہے، عارف عین الیقین سے متصف ہوتا ہے اور حکیم حق الیقین کا حامل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو حکیم بنائیں نہ کہ عالم وعارف۔

عالم وہ ہوتا ہے جو سانپ اور مچھلی دونوں کو جانتا ہے مگر اس کے احوال وآثار کی بنیاد پر دونوں کے درمیان فرق نہیں کر پاتا اور نہ اس کے مطابق عمل کر پاتا ہے۔ لہٰذا نہ وہ سانپ کو حرام سمجھتا ہے اور نہ مچھلی کو حلال، بلکہ دونوں اس کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ عارف وہ ہے جو سانپ اور مچھلی کے درمیان فرق کرتا اور سانپ کو حرام اور مچھلی کو حلال سمجھتا ہے، مگر اس فرق کے مطابق عمل نہیں کرتا اور حکیم وہ ہے جو اشیا کی حقیقت کما حقہ جانتا ہے، سانپ کو حرام اور مچھلی کو حلال سمجھتا ہے اور اس فرق کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔ یعنی سانپ کے زہر کو مضر سمجھتے ہوئے اس سے احتراز کرتا ہے اور مچھلی کو نفع بخش سمجھتے ہوئے بطور غذا کے استعمال کرتا ہے۔

آں عزیز نے لکھا ہے کہ شیخ علاء الدولہ سمنانی نے شیخ اکبر کی طرف بعض نامناسب جملے منسوب کر کے لکھا ہے کہ 'حقیقت بیان واقعی چیست؟ وحق بجانب کیست؟ ایں فقرہ در تبعیت سخن کدام باشد؟'

اے برادر! دونوں کو بزرگ سمجھنا چاہیے اور فریقین کے کلام کو حق تعالی کی شدید محبت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے، کیوں کہ دونوں حضرات کا نزاع وحدتِ وجود کے مسئلے میں ہے۔ حکمائے متکلمین کی اصطلاح میں وجود ہر شے کی ماہیت وحقیقت کے عارض کا نام ہے اور محققین صوفیہ کے نزدیک وجود 'معروضِ موجوداتِ ممکنات' کا نام ہے۔ کیوں کہ ہر موجود کی دو حالت ہوگی: یا تو وجود ممکن ہوگا یا وجود واجب ہوگا۔ وجودِ ممکن یہ ہے کہ اس کا وجود ایسے غیر سے مستفاض ہو جس کی ذات کی حقیقت اس کے متغایر ہو۔ اور وجودِ واجب یہ ہے کہ اس کا وجود بذات خود عین اس کی ذات ہو، کسی موجود سے مستفاض نہ ہو۔ اسی لیے صوفیہ اللہ تعالی کو موجود نہیں کہتے ہیں، بلکہ وجود کہتے ہیں۔ کیوں کہ لفظ موجود سے احدیتِ وجود میں دوئی کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ اور ممکنات کو صوفیہ موجود کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ مفعول کا صیغہ ہے جو غیر کے وجود سے مستفاض ہے۔

شیخ اکبر نے حق تعالی کو جو وجودِ مطلق کہا ہے، وہ اس معنی میں ہے کہ حق تعالی کی ذات خاص و عام، کلی و جزئی اور تقید و تعدد کی قیود سے مطلق ہے، نہ کہ عام معنی میں۔ اس طریقۂ تعبیر سے شیخ اکبر کا مقصود حکمائے متکلمین کا رد کرنا ہے جو اللہ تعالی کو 'خبرے حقیقی متعین بذات خود' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ رد اس لیے بھی ضروری ہے کہ منطق کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر مفہوم متعین شخص ہو تو اس کو مقید اور جزئی اضافی کہتے ہیں، اور اگر متعین شخص نہ ہو تو اس کو عام اور مطلق کہتے ہیں، جس کا وجود خارج میں موجود نہیں ہوتا ہے۔

یہاں شیخ علاء الدولہ کے ذہن میں لفظ مطلق سے مطلق کا عام معنی آیا، اس سے انھوں نے سمجھا کہ حق تعالی وجودِ مطلق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ وہ خارج میں موجود نہ ہو۔ اسی وجہ سے شیخ اکبر کی طرف نسبت کر کے انھوں نے لعن طعن کی ہے۔

اگر دونوں حضرات کے مذہب کا حاصل دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ شیخ علاء الدین قدس سرہ پر شریعت کا غلبہ تھا، پس انھوں نے بغیر غور وخوض اور تدقیق کے جو متبادر معنی تھا، وہ سمجھا۔ اور شیخ اکبر پر از روے علم اور از روے تحقیق توحید کا حال غالب تھا، ان کو مخلوق کا کوئی خوف نہیں تھا، انھوں نے عشق کی آنکھ سے ہر ذرہ میں جمالِ محبوب کا مشاہدہ کیا اور حق تعالی کو وجودِ مطلق سے تعبیر کیا۔ ان کی ہمہ وقت تسبیح یہ تھی: سبحان من اظہر الاشیاء وہو عینہا۔

بہر رنگے کی باشی جامہ می پوش
کہ من آں جلوۂ قدرت شناسم

واضح رہے کہ صرف مسئلۂ وحدتِ وجود کو پڑھنے اور لکھنے سے وجدان وشہود کو کچھ حاصل نہیں ہوگا، جب تک کہ اپنی ذات وصفات کو وجودِ حقیقی واجبی کی ذات وصفات میں محو ومنتفی نہ کردے اور حق الیقین نہ حاصل کرلے۔ اور یہ مرتبہ اس وقت تک حاصل نہ ہوگا جب تک ذکر کا غلبہ نہ ہوجائے: واذکر ربک اذا نسیت[۲۰]۔ اور ذکر کا غلبہ صرف صفائِ قلب سے حاصل ہوتا ہے اور تصفیۂ دل اپنی ذات میں مراقبہ اور تفکر سے حاصل ہوتا ہے: فی انفسکم افلا تبصرون [۲۱] اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد دوئی ختم ہوجاتی ہے اور وحدتِ وجود حاصل ہوجاتا ہے۔ کل شئی ہالک الا وجہہ[۲۲]

مکتوبِ نہم

برادر اسعد، ہدایت آگیں شیخ شمس الدین!

تم ہمیشہ تجلیاتِ الٰہی سے منور اور اپنی ضیا سے روشن رہو، غیر کی ضیا سے نہیں، کیوں کہ حق غیور ہے:

غیرتش غیر در جہاں نہ گذاشت
لاجرم جملہ عین اشیا شد

اس اعتبار سے تمھاری ضیا عین حق کی ضیا ہوگی۔ فما وصفناہ بوصف الا کنا نحن ذالک الوصف۔ جیسا کہ شیخ اکبر نے 'فص الآدمی' میں کہا ہے کہ: ولما کان استنادہ الی من ظہر عنہ لذاتہ اقتضی ان یکون علی صورتہ فیما نسبت الیہ من کل شئی من اسم و صفۃ ما عند الوجوب الذاتی۔ یعنی انسان اور تمام موجودات کی نسبت جب کسی کی طرف کی جائے گی تو منسوب الیہ بھی منسوب میں منعکس وظاہر ہوگا۔ یعنی حق تعالی نے انسان کو اپنی ذات [جو کہ واجب الوجود ہے] کے لیے پیدا اور ظاہر کیا۔ لہٰذا انسان کی ذات جو اللہ کے لیے ہے، اس سے مطالبہ ہوا کہ وہ ان تمام

چیزوں میں جس کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے، مثلاً خالقیت، رازقیت، ربوبیت، نور اور برہان، سب میں حق کی صورت میں ہوجائے۔ گویا کہ جو کچھ حق تعالی میں ہے، وہ سب انسان میں نظر آنے لگے۔ الانسان سری وانا سرہ [۲۳] اسی معنی کا غماز ہے۔ لذا اللہ الحق اوجدنی فاعلمہ فاوجدہ لہ جاء الحدیث لنا و تحقق فی مقصدہ۔ مگر وجوبِ ذاتی اللہ تعالی کا خاصہ ہے اور حدوث انسان کا خاصہ ہے۔

آں عزیز نے لکھا تھا کہ 'روح ایک لطیف چیز ہے اور جسم مٹی میں مل کر مٹی ہوجاتا ہے تو عذابِ قبر کس چیز پر ہوتا ہے؟ حالاں کہ عذاب معاصی کے ساتھ خاص ہے، کم وبیش ہر گنہ گار کو جس کو اللہ تعالی چاہیں گے عذاب دیں گے۔'

اے عزیز! اس معنی کا انکشاف ہر شخص کے سمجھ میں نہیں آسکتا اور اس غامض بحث کو بیان کرنے کے لیے بہت لمبی تفصیل کی ضرورت پڑے گی، مگر اما السائل فلا تنہر [۲۴] کے حکم کے پیش نظر کچھ چیزیں اجمالاً لکھی جاتی ہیں:

اولاً یہ سمجھو کہ روح کس کو کہتے ہیں؟ وہ کیا چیز ہے؟ جب روح کو سمجھ لوگے تو خود بخود تم کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا کہ وہ قابل تعذیب ہے یا نہیں؟ روح کی تفسیر میں اہل ظواہر، حکما اور صوفیہ کے متعدد اقوال ہیں: بعض صوفیہ کہتے ہیں کہ 'روح لطیفۂ انسانی ہے جو مادے سے مجرد ہے۔' بعض اطبا کہتے ہیں کہ 'روح بخارِ لطیف ہے جو قلب سے پیدا ہوتا ہے اور قوتِ حیات اور حس وحرکت کو قبول کرتا ہے۔' اور ان کی اصطلاح میں اس کو نفس بھی کہتے ہیں اور جو چیز کلیات و جزئیات کا ادراک کرنے والی ہوتی ہے، اس کو قلب کہتے ہیں۔ اور حکما قلب، روح اور نفس ناطقہ ایک ہی چیز کو کہتے ہیں، ان کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور محققین صوفیہ کہتے ہیں کہ 'روح کے بارے میں اللہ تعالی نے قرآن مجید میں خود اپنے رسول کو تعلیم دی ہے: قل الروح من امر ربی [۲۵] یعنی روح حق تعالی کا امر ہے، اور حق تعالی کا امر حق تعالی کی صفت ہے اور حق تعالی کی صفت اس کی ذات ہے۔ گویا کہ روح تیرے پروردگار کی ذات ہے۔ کیوں کہ مآلِ امر عینِ ذات ہی ہوگا۔ جیسے تم اپنی ذات کے متعلقات کو حکم دو، یعنی اپنے قد کو کہو کہ کھڑے ہوجاؤ تو اس کا کھڑا ہونا تمھاری ہی صفت بنے گا اور یہ تمھارا کھڑا ہونا عین تمھاری ذات کی حقیقت ہے، اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

پس ہر شے کی روح اس شے کی حقیقت ہوتی ہے اور ہر شے کی حقیقت حق تعالیٰ کی ذات وعین ہے۔ لا موجود الا اللہ اسی معنی کا شاہد حال ہے۔ قل ہو اللہ احد اس کی احدیت اس معنی کر کے ہے کہ تمام موجودات کی حقیقت وہی ذات واحد صمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد ہے۔

پس جب تم نے جان لیا کہ محققین کے نزدیک روح حق تعالیٰ کی ذات ہے تو یہ بات یقینی ہوگئی کہ وہ قابل عذاب نہیں ہے اور جسم جو کہ نام ہے اعضا کا، یعنی ہاتھ پاؤں وغیرہ، یہ سب جمادات کے قبیل سے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی قابل عذاب نہیں ہیں۔ چوں کہ اعضا کو مطلق کوئی علم نہیں ہوتا ہے۔ نفس مدبر مکلف جو بھی حق تعالیٰ کی عبادت کے تعلق سے حکم کرتا ہے اور حسنات وسیئات کے حکم کے ذریعہ جو بھی تصرف کرتا ہے، اعضا اسے قبول کرتے ہیں۔ کیوں کہ اگر اعضا جانتے کہ نفس جو حکم دے رہا ہے، وہ معصیت ہے یا طاعت، تو ہرگز معصیت میں اس کے حکم کو قبول نہیں کرتے۔ ہاں یہ ہے کہ اعضا کے اندر یاد رکھنے کی قوی صلاحیت ہے۔ نفس جس حکم کے ذریعہ بھی اعضا میں تصرف کرتا ہے، وہ اسے یاد رکھتے ہیں لیکن طاعت ومعصیت میں امتیاز نہیں کر پاتے۔ اور نفس کے اندر اس امتیاز کی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفس جب قیامت کے دن معصیت سے انکار کرے گا تو اعضا سے ان تصرفات کی گواہی لی جائے گی جو نفس نے کیا ہے۔ چنانچہ آنکھ کہے گی کہ 'مجھ سے فلاں کی ستر دیکھی تھی' اور زبان گواہی دے گی کہ 'مجھ سے فلاں کو گالی دیا تھا' غرض تمام اعضا گواہی دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر اعضا کو عذاب ہوتا تو وہ معصیت کی گواہی نہیں دیتے بلکہ نفس کی طرح انکار کرتے۔ لہٰذا عذاب نفس کو ہوگا جو معصیت کا حکم دینے والا ہے اور راحت بھی نفس ہی کو حاصل ہوگی جو طاعت کا حکم دینے والا ہے۔ جب نفس کو عذاب دیا جائے گا تو جو آگ وغیرہ اعضا پر لپٹے گی، وہ ان اعضا کے لیے عذب وشیریں بن جائے گی، اس عذاب سے اعضا متالم اور دردناک نہیں ہوں گے، جیسے کہ عذاب دینے والے فرشتے آگ کا عذاب دینے کی وجہ سے متالم اور دردناک نہیں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اعضا کو محلِ انتقام اس نفس کی وجہ سے بنایا ہے جو ان کو حکم دیتا تھا۔ لہٰذا ضرب اور درد والم اعضا پر طاری ہوگا جو حواس کے واسطے سے اعضا سے گزر کر نفس تک پہنچے گا اور جوارح جہنم میں بھی نعمت نعیم میں ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص سوچے کہ اعضا

کے اندر احساس ہوتا ہے تو وہ بھی متالم اور دردناک ہونے چاہییں تو اس کا یہ خیال غلط عام ہے۔

مکتوب دہم

برادرم وحیدالدہر جو مسکین کے سلسلہ سے وابستہ ہے یعنی شیخ شمس الملۃ والدین

برادر! یہاں مسکنت سے وہ مسکنت مراد نہیں ہے جو شر ہوتی ہے۔ یعنی وہ درویشی و بے نوائی جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے، بلکہ یہاں وہ مسکنت مراد ہے جو خاص ہوتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاے یتیماں میں مانگا ہے: اللھم احینی مسکیناً وامتنی مسکیناً واحشرنی فی زمرۃ المساکین یوم القیامۃ[۲۶]۔ یعنی مسکین وہ شخص ہوتا ہے جو اپنا کوئی مقام و مرتبہ نہ سمجھتے، جو کہ انبیا علیہم السلام کا خاصہ ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب الٰہی میں التجا کی: واحشرنی فی زمرۃ المساکین۔

آں عزیز نے سوال کیا ہے کہ اس شعر کے معنی میں تطبیق کیسے دی جائے گی؟

چار بودم سہ شدم اکنوں دوم
از دوئی بگذشتم و یکتا شدم

اے عزیز! بادی النظر میں اس شعر کا معنی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسان ہمیشہ چار خطروں میں گھرا ہوتا ہے: خطرۂ شیطانی، خطرۂ نفسانی، خطرۂ ملکی اور خطرۂ رحمانی۔ انسان کو ریاضت ومجاہدہ خصوصاً ذکر کے ذریعے ابتدا کے تین خطروں کو دفع کرنا چاہیے اور چوتھے خطرے کو ثابت ودائم کرنا چاہیے۔ جب ابتدا کے تینوں خطرے دور ہوجائیں اور چوتھا خطرہ ثابت و دائم ہوجائے تو پھر انسان یہ شعر پڑھ سکتا ہے۔

مگر یہ افہام وتفہیم کے لیے ایک طالب علمانہ توجیہ ہے۔ چوں کہ خطرات پر ذات کا اطلاق نہیں ہوسکتا، کیوں کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں خطرۂ شیطانی ہوں۔ اور شعر میں 'چار بودم سہ شدم اکنوں دویم' متکلم کے صیغے استعمال ہوئے ہیں، لہٰذا اس نوع کی تحریر وتقریر میں چار متکلم کا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے شعر کا مطلب یہ بیان کیا جائے گا کہ سالک کی ذات ابتدا میں

چار ذات سے مرکب ہوتی ہے: ایک اس کی ذات، دوسرے مرشد کی ذات، تیسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور چوتھے حق تعالی کی ذات۔ جب تک سالک چاروں ذات سے مرکب ہوتا ہے، اس وقت تک وہ ناقص ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وہ بالترتیب ایک ایک ذات میں فنا ہوتا جاتا ہے درجۂ کمال حاصل کرتا جاتا ہے۔ جب سالک ابتدا کی تینوں ذات میں فنا ومحو ہوکر چوتھی ذات یعنی حق تعالی تک پہنچتا ہے تو ادائے شکر کے لیے یہ شعر اس کی زبان پر جاری ہوجاتا ہے۔

اول مقام پر سالک کی ذات، مرشد کی ذات، رسول کی ذات اور حق تعالی کی ذات تھی، جسے سالک نے اپنی اصطلاح میں یعنی برزخ اصغر، صغری، کبری اور اکبر چار برزخ سے تعبیر کیا اور کہا 'چار بودم'، جب ترقی کی اور خود کو فانی کرکے فنا فی الشیخ کا مقام حاصل کرلیا تو کہا 'سہ شدم'، اس سے ترقی کرکے 'فنا فی الرسول' کے درجے پر پہنچا تو کہا 'اکنوں دوم' اور پھر جب درجۂ کمال تک رسائی حاصل کرلی اور فنا فی اللہ ہوکر بقائے ابدی کا مستحق ہوگیا تو کہا 'از دوئی بگذشتم و یکتا شدم'۔

سالک بھی راہ رو کی طرح ہوتا ہے۔ راہ رو کے لیے چار رفیق کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو راستہ طے کرنے میں اور منزل مقصود تک پہنچانے میں اس کے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: الرفیق ثم الطریق[۲۷]۔ لہٰذا سالک کے لیے سلوکِ باطن میں ان چار برزخ کا ہونا ضروری ہے جن کی مدد سے وہ توحید کی منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔

مکتوب یازدہم

برادر اعز با تمکین فی الحق مع الحق للحق شیخ شمس الدین والحق دام نور الباطن والظاہر!

کیوں کہ شمس الدین منوّر رہتا ہے یعنی دوسروں کو روشنی بخشتا ہے جو اللہ تعالی کی صفت ہے۔ شمس الدین ذات وصفات میں مقید امکان ہے اور اپنی بعض صفات میں ذات واجب الوجود میں پیوست بلکہ عین حق ہے۔ شمس الدین متنوّر نہیں ہے یعنی غیر سے نور کسب کرنے والا نہیں ہے، جیسے چاند سورج سے اکتساب نور کرتا ہے۔

تم نے سوال کیا کہ 'مسلمانی کیا ہے اور مسلمان کون ہوتا ہے؟' میرے بھائی! اس کا جواب خاصا مشکل ہے، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اس طرح کے پیچیدہ سوال و جواب کے تکلف میں پڑوں، لیکن چوں کہ اس سوال نے تم کو الجھن میں ڈال رکھا ہے، اس لیے افہام و تفہیم کے لیے حسب حال چند سطریں لکھتا ہوں:

صحیحین میں نقل متواتر سے میرے جد امجد شیخ الشیوخ، الفارق بین الخطا والصواب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ روح الامین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ما الاسلام؟ یعنی مسلمانی کیا ہے؟ اور مسلمان کون ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ 'کلمہ طیبہ کی گواہی دینا، پنج وقتہ نماز ادا کرنا، رمضان میں روزہ رکھنا، مال کی زکوۃ ادا کرنا اور خانہ کعبہ کا حج کرنا مسلمانی ہے[۲۸]۔ جس انسان نے یہ پانچ ارکان ادا کر لیے، وہ مسلمان ہے۔

میرے بھائی! کلمہ طیبہ کی گواہی سے مراد صرف زبان سے 'لا الہ الا اللہ' کہنا نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی کا سمجھنا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر عین وہی معنی ہو جانا ہے۔ یعنی لا الہ الا اللہ کا مطلب لا موجود الا اللہ ہے۔ غیر کے وجود سے دل کو بالکل صاف اور خالی کر لینا ہے۔ التصوف صیانۃ القلب عن الغیر کا یہی مطلب ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ [۲۹] کیوں کہ جس وقت اس نے کلمہ طیبہ کو سمجھا تو اس نے جان لیا کہ وہ بت جس کو میں اللہ تعالی کا شریک ٹھہرا رہا تھا، وہ عین خدا ہی کی ذات ہے، اس کے ماسوا کچھ اور نہیں ہے۔ تو اسی وقت کفر عین اسلام ہو گیا۔ کیوں کہ علمائے ظواہر کے نزدیک شرک یہ ہے کہ غیر حق کو حق سمجھا جائے اور اہل باطن کے نزدیک شرک یہ ہے کہ حق کو غیر حق سمجھا جائے۔ مثلاً ایک شخص ہمیشہ زید سے ملتا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ یہ زید نہیں ہے بلکہ اس کا غیر ہے، پھر جس وقت اس نے جانا کہ یہی زید ہے، زید کا غیر نہیں ہے تو اس کا کفر ختم ہو گیا۔ اور اسی قیاس پر تمام گناہ ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ[۳۰]۔ ان الحسنات یذہبن السیئات[۳۱]۔ اور اللہ تعالی نے قرآن پاک میں فرمایا: اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء نحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال انی اعلم

مالا تعلمون[۳۲]۔ یعنی انسان کی نیکیاں برائیوں کوختم کر دیتی ہیں۔ خاتم الاولیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: ما رایت شیئاً الا رایت اللہ فیہ۔ یعنی کلمہ نفی میں بھی اللہ ہی کو دیکھے اور اثبات میں بھی اللہ ہی پر نظر رہے، اور اللہ کے سوا کسی کو نہ نفی کرنے والا سمجھے اور نہ اثبات کرنے والا، ورنہ کلمۂ توحید شرک بن کر رہ جائے گا۔ گویا کہ جو شخص کتاب اللہ اور کتاب الرسول ہو جائے، اس میں مسلمانی پائی جائے گی۔ جو شخص زندگی ہی میں موتوا قبل ان تموتوا[۳۳] کا استحضار حاصل کر لے، دنیا کو مثل قبر سمجھے اور موت کی رستخیزی کا منتظر رہے، وہ مسلمان ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے قبرستان میں جب سکونت اختیار کی تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے زندوں پر مردوں کو کیوں ترجیح دی؟ فرمایا 'اس وجہ سے کہ مردے نہ غیبت کرتے ہیں اور نہ گناہ۔' لہٰذا موت کو زندگی سے باہر کرنا میت کا شرک ہے، کیوں کہ اس میں روح نہیں ہے، اگر روح ہوتی تو نیک و بد کا امتیاز کر لیتی اور موحد ہوتی نہ کہ مشرک، بلکہ عارفوں کے نزدیک میت وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو نہ دیکھے بلکہ اپنی حقیقت کو دیکھے۔ چنانچہ اسی کے متعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: من اراد ان ینظر الی میت تمشی علی وجہ الارض فلینظر الی ابن قحافۃ[۳۴]۔ تو حقیقت میں زندہ وہ شخص ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح میت ہو جائے۔

اسی طرح نماز سے مراد مجازی نماز نہیں ہے جس میں عوام اور اہل ظواہر جبہ و دستار میں ملبوس ریا اور شہرت کی غرض سے مشغول نظر آتے ہیں، حالاں کہ ان کو معرفت کا شائبہ تک حاصل نہیں ہوتا، ہمیشہ نفسانی مراد اور شیطانی خطرات کے چنگل میں گرفتار فاسد خیالات کے اسیر رہتے ہیں، جس سے سوائے شیطنیت، ضلالت اور بت پرستی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بلکہ مراد حقیقی نماز ہے۔ خاصان خدا بظاہر قیام، قعود اور سجدہ کرتے ہیں، مگر حقیقت میں ان اعمال سے ان کی مراد دوسری ہوتی ہے۔ یعنی نماز کی ادائیگی سے ان کا مقصد محبوبِ حقیقی کے جمال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ جب وہ مصلے پر کھڑے ہوتے ہیں تو ایسے کھڑے ہوتے ہیں جیسے غلام تخت شاہی کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان العبد اذا قام قام بین یدی الرحمان[۳۵]۔ ماسوی اللہ کی محبت وہ دل سے محو کر دیتے ہیں۔ فقیر نے خاصان خدا کی نماز کا تذکرہ ایک دوسری جگہ یعنی 'اورادِ بدائع اربع' میں کیا

ہے جس کو شوق ہو وہاں دیکھ لے۔

اسی طرح روزہ سے مجازی روزہ مراد نہیں ہے کہ کھانا اور پانی جس کو اللہ تعالی نے حلال کیا ہے، اس سے اپنے آپ کو روک لے اور جو اللہ تعالی نے حرام کیا ہے مثلاً غیبت اور فحش گوئی وغیرہ، اس سے باز نہ آئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ روزہ دار ہے۔ بلکہ حقیقی روزہ مراد ہے۔ خواص دل سے شعورات دینی و دنیاوی بلکہ ماسوی اللہ سے امساک کر لیتے ہیں، غیر اور غیریت کا خیال تک ان کے دل میں نہیں آتا۔ صوموالرویتہ وافطروالرویتہ[۳۶] اسی معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

اسی طرح زکوۃ سے مال مجازی کی زکوۃ مراد نہیں ہے جس کو عاقل و بالغ صاحبِ مال وسیم وزر صاحبِ نصاب ہونے کے بعد ادا کرتے ہیں۔ یعنی جب انسان دوسو رائج الوقت سکے کا مالک ہوجائے تو اس میں سے پانچ سکہ فقیر کو دے دے۔ صد افسوس کہ اہل حرص عاقل، بالغ، مال دار و غنی ہوجائیں اور ان حریصوں کے مرتبے تک کوئی بے عقل مجنوں، طفل ناداں اور کم عقل نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ ایک شخص نے اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ماالعقل یا رسول اللہ! تو آپ نے جواب دیا: ادناہ ترک الدنیا[۳۷]۔ بلکہ زکوۃ سے حقیقی زکوۃ مراد ہے۔ یعنی یہ کہ عارف باللہ اہل ضلالت کو جو سبھی معنوں میں فقیر ہیں، اللہ کے ہزاروں کلمات میں سے ایک دو کلمہ عنایت کردیں اور صراطِ مستقیم کی طرف ان کی رہبری کردیں۔

اسی طرح حج سے مراد پتھر کے مکان کی چاروں دیواریں نہیں ہیں جہاں موسم حج میں مخلوقِ خدا جمع ہو کر مناسکِ حج یعنی طواف، سعی اور رمی و جمار وغیرہ کرتی ہے۔ کیوں کہ کفار بھی اپنی رسومات میں بت پرستی کے افعال انجام دیتے ہیں۔ بلکہ عارفوں کے نزدیک خانۂ کعبہ سے مراد صاحبِ خانۂ کعبہ ہے۔ وہ جو بھی عمل کرتے ہیں صاحبِ خانہ کے لیے کرتے ہیں نہ کہ خانہ کے لیے۔ جس شخص نے خانہ کو محو کر دیا اس نے صاحبِ خانہ کو پالیا:

طواف کعبۂ دل کن اگر دل داری
دل ست کعبۂ معنی اگر بدست آری

شاعر نے کہا ہے:

بطواف کعبہ کجا می روی صفا ایں جا ست

به عزم مکه چه سر می زنی خدا این جاست

پس اس معنی کے اعتبار سے [جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ہے] مسلمانی اور مسلمان کم پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے سلف صالحین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے فرمایا ہے کہ 'اب مسلمانی صرف کتاب میں ہے اور مسلمان قبرستان میں ہیں۔'

مکتوب دوازدہم

برادر شاہد دنیا و دین شیخ شمس الدین! دام شہادتہ

میرے بھائی! ہر چیز کا کمال اس کی وضع ہے۔ یعنی جس چیز کے لیے وہ بنائی اور پیدا کی گئی ہے۔ پس انسان کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، اس پر کاربند رہے۔ یعنی مقام جمع الجمع میں جو کہ کثرت سے عبارت ہے، اس کو لازم کر کے وحدت کو عین کثرت اور کثرت کو عین وحدت سمجھے، بلکہ عین وحدت و کثرت کو محبوب رکھتے اور درجہ بدرجہ احدیت، وحدت، واحدیت، ارواح، امثال، اجسام اور انسان [یہ عالم شہادت کا نام ہے] سے قرار حاصل کرے۔ لہٰذا سالک کو چاہیے کہ سات مرتبہ عروجاً و نزولاً اس حساب سے چلے اور ہر مرتبہ عالم شہادت میں عین کثرت میں وحدت کو دیکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے :لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل [۳۸] فرمایا ہے، لی مع اللہ دوام نہیں فرمایا ہے۔ لہٰذا مراد یہ ہے کہ مراتبِ عروج کو کثرت میں دیکھے، تا کہ اس کی صفت کا شاہد ہو جائے۔

میرے بھائی! تم نے اس شعر کی تشریح کے لیے کہا ہے:

ز دریاے شہادت چوں نہنگ لا برادر ھو
تیمم فرض گردد نوح را در عین طوفانش

بھائی! صوفیانِ اہل صفا کا ہر لفظ ایک اصطلاح ہوتا ہے۔ ان کی اصطلاح میں 'دریاے شہادت' سے مراد 'عالم کثرت'، 'نہنگ لا' سے 'دل'، 'ہو' سے 'مقام ہویت' مراد ہے، جس کو مرتبہ وحدت بھی کہتے ہیں، 'تیمم' سے 'مٹی کی طرف رجوع' یعنی عالم شہادت کی طرف رجوع اور 'نوح'

سے 'کشتی کا سوار' مراد ہے جو کہ طوفانِ وحدت میں غرق ہے۔ اب پہلے مصرعے 'زدریائے شہادت چوں نہنگ لا برادر ہو' کا مطلب ہوگا کہ عالم کثرت سے دل ترقی کر کے اگر مقام ہویت یعنی مرتبہ وحدتِ محض تک پہنچ جائے تو تیمم فرض ہوجائے گا، نوح کو عین طوفان یعنی عین وحدت میں کثرت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، ورنہ سالک نہیں رہے گا، یا تو اس مقام کی گرمی کی وجہ سے ہلاک ہوجائے گا یا پھر مجذوب ہوکر مرجائے گا۔ اور یہ عمل اللہ کی مرضی اور محبت کے خلاف ہوگا۔

مکتوب سیزدہم

مقبول دلہا سلامت!

ذوق وشوق کی ترقی کی دعا کے بعد، لغوی اعتبار سے ایمان شریعت کے قبول وحصول کے اظہار کو کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں خدا، ملائکہ، کتب، رسل، یوم آخرت اور اچھی و بری تقدیر کا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنے کو کہتے ہیں۔

جہم بن صفوان کے نزدیک ایمان دل کی معرفت کا نام ہے، اقرار شرط نہیں ہے، حشویہ اور کرامیہ کے نزدیک ایمان دل سے اقرار کو کہتے ہیں، دل کی معرفت شرط نہیں ہے، معتزلہ کے نزدیک ایمان نام ہے زبان کے اقرار، دل کے اعتقاد، جوارح کا عمل اور بڑے گناہوں سے دور رہنے کا، امام شافعی کے نزدیک ایمان عبارت ہے زبان کے اقرار، دل کی تصدیق اور جوارح کے عمل سے، خوارج کے نزدیک ایمان زبان کے اقرار، دل کی تصدیق، جوارح کا عمل اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے دور رہنے کا نام ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک زبان کا اقرار اور دل کی تصدیق کا نام ایمان ہے۔ پس اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہے جیسا اس کی معرفت کا حق ہے، اور وہ توحید ودین کا اعتقاد رکھتا ہو، اور کفر سے بیزار ہو لیکن زبانی اقرار سے یہ بات ظاہر نہ ہوئی ہو اور وہ اقرار کی کیفیت کو نہ جانتا ہو اور زبان سے کفر ظاہر کررہا ہو تو ایسا شخص اللہ کے نزدیک مومن ہے اور مخلوق کے نزدیک کافر ہے۔ اور اگر کوئی شخص زبان سے اقرار کرے، مگر دل سے تصدیق نہ کرے، تو وہ اللہ کے نزدیک کافر اور مخلوق کے نزدیک مومن ہے۔ اور جو شخص دل سے اعتقاد

رکھے اور زبان سے اقرار بھی کرے تو وہ اللہ تعالی، ملائکہ اور انسانوں کے نزدیک مومن ہے۔ اور جو چیز خبر واحد سے ثابت ہو اور فقہاے امت کا اتفاق اس کو قبول کرنے پر ہو تو وہ خبر ایمان کی صحت کے لیے شرط ہو جاتی ہے، جیسے واقعۂ معراج۔ لہٰذا ان چیزوں پر ایمان لانا واجب ہے۔

اور شرائع ایمان میں سے نہیں ہے، لہٰذا بغیر شرائع کے بھی ایمان درست ہے۔ شرائع اور شرائط کے درمیان فرق یہ ہے کہ شرائط کو ملت کہتے ہیں اور شرائع کو خدمت۔ ملت بغیر خدمت کے صحیح ہوتی ہے لیکن خدمت بغیر ملت کے صحیح نہیں ہوتی، اور ملت میں دوام کی شرط ہے اور خدمت میں دوام کی شرط نہیں ہے۔ پس اگر کوئی مومن اوامر میں چند چیزیں ترک کر دے اور چند گناہوں کا ارتکاب کر لے تو وہ کافر نہیں ہوگا، کیوں کہ ایمان بسیط ہے، نہ کم ہوتا اور نہ زیادہ اور نہ ہی سلب ہوتا ہے، ہاں اگر اوامر کا ترک اور نواہی کا ارتکاب حلال سمجھ کر کرے تو کافر ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ اگر کوئی شخص زبان سے اقرار کرے اور دل سے تصدیق کرے تو اس کو مومن کہیں گے، چاہے مرنے سے ایک ساعت پہلے ہوش و حواس کے ساتھ اقرار و تصدیق کیا ہو۔ اس اعتبار سے شیخ اکبر نے فرعون کے بارے میں جو کہا ہے: فقبضه طاہر و مطہر، وہ صحیح ہے۔

مکتوب چہاردہم

برادرم محقق اہل حق فی الحق مع الحق خاتم معانی رانقش میر فیض بخش دام فیضہ

فیض سے مراد فیض اقدس ہے نہ کہ فیض مقدس۔ فیض اقدس یہ ہے کہ ذات کا فیض اسما و صفات کے واسطے کے بغیر اعیانِ ثابتہ پر ہو، اور فیض مقدس یہ ہے کہ ذات مقدس کا فیض تمام چیزوں تک اسما و صفات کے واسطے سے پہنچے۔

میرے بھائی! تم نے قاب قوسین کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا۔ میرے بھائی! اس معنی کے انکشاف میں تفصیل کی ضرورت پڑے گی، عجلت کی وجہ سے اجمالاً لکھتا ہوں:

'قاب' لغت میں 'مقدار اور کمان کے قبضے کے درمیان' کو کہتے ہیں، اور قاب قوسین دو کمان کی مقدار کو، اور اس سے مراد انتہائی قرب ہے۔ قرآن میں سورہ نجم میں ہے: وہو بالافق الاعلی ثم دنی فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی[۳۹]۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

کنارۂ بلندی پر تھی،'ثم دنی'، پھر نزدیک ہوئی، 'فتدلی'، پھر نزدیک ہوئی،'فکان قاب قوسین'، پھر ان کی نزدیکی دو کمان کے برابر ہوئی،'او ادنی' یا دو کمان کی مقدار سے بھی کم نزدیکی ہوگئی۔یعنی بہت قریب ہو گئے۔

تفسیر مدارک میں لکھا ہے: فکان مقدار مسافة القربة مثل قاب قوسین۔ یعنی انتہائی قرب ہوگیا۔لیکن صوفیہ کی اصطلاح میں'قاب قوسین' سے مراد وہ درمیانی خط ہے جو قوسِ احدیت اور قوسِ واحدیت کے درمیان امتیاز پیدا کرتا ہے۔اس کو وحدت، برزخِ کبری، حقیقت محمدی اور انسان بھی کہتے ہیں۔ یہ ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتا، اس کو سمجھانے کے لیے اس سے زیادہ صریح عبارت اور مثال بیان کرنی پڑے گی۔

میرے بھائی! جمیع ظہور الٰہی اور وجود عالم انگشتری کی طرح دَوری اور کروی ہے۔ کیوں کہ موجودات کی ابتدا وجودِ حقیقی یعنی اللہ سے ہے۔ چنانچہ موجودات کا مبدا و منتہا اللہ کے وجود سے ہے۔ اللہ تعالی نے خود قرآن میں الیه یرجع الامر کله[۴۰] فرمایا ہے۔ اور انسان جو کہ ظہور و وجود کا آخری مرتبہ ہے، وہ قوسِ احدیت اور واحدیت کے درمیان امتیاز پیدا کرنے والے خط کی طرح ہے یا اس انگوٹھی کے نگینے کے نقش کی طرح ہے جو انگوٹھی کا حاصل و خلاصہ ہے۔ گویا کہ انسان اسمائے الٰہی اور صفاتِ نا متناہی کا نقش ہے، کمالِ وجود اسی سے ہے اور ظہور کا مقصد بھی وہی ہے۔لولاک لما اظهرت الربوبية[۴۱] اسی کے لیے ہے۔ حق کا اپنی مخلوق کو دیکھنا اسی کے سبب سے ہے، وجوب و امکان کے درمیان امتیاز کا خط اسی کا ظہور ہے۔

میرے بھائی! اس سے بھی زیادہ وضاحت کے لیے اور مبتدیوں کو سمجھانے کے لیے اس شکل کا دائرہ بناتا ہوں۔ یہ دائرہ کروی ہے اور تجلیات و مراتب الٰہی بھی کروی ہیں۔ اگر وہ دائرہ اس شکل کا ہو تو مراتب ہفت گانہ: ذات، اسما، صفات، عالم، اجسام، نو فلک، کرۂ نار، کرۂ ہوا، کرۂ آب، کرۂ خاک اور ظہور نباتات، حیوانات اور انسان کے درمیان فرق نہیں رہے گا، وجوب و امکان دونوں ایک ہو جائیں گے، لیکن اگر دائرہ کے درمیان ایک خط کھینچ دیا جائے، اس شکل کی طرح [تو فرق ہو جائے گا]

حوالے وحواشی

۱- یہ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف: کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لکی اعرف۔ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، اس لیے مخلوق کو پیدا کیا۔

صوفیا اسے حدیثِ قدسی کے طور پر نقل کرتے ہیں، مگر اس متن کی کوئی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔

۲- مشکوۃ المصابیح: ۳۵۲۵۔ (ترجمہ) اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔

۳- (ترجمہ) جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اللہ کو پہچان لیا۔

بعض لوگ اسے بہ طور حدیث نقل کرتے ہیں مگر محدثین نے صراحت کی ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے۔

۴- مکتوب میں مذکور الفاظ ثابت نہیں ہیں، محدثین نے ان الفاظ کے بارے میں لکھا ہے لا اصل لہ۔ البتہ مفہوم درست ہے، کیوں کہ اس کی تائید بعض صحیح احادیث سے ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے: قالوا یا رسول اللہ! متی وجبت لک النبوۃ؟ قال: وآدم بین الروح والجسد۔ [ترمذی: ۳۶۰۹]

۵- سورہ بنی اسرائیل: ۴۴۔ (ترجمہ) اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو۔

۶- الانفال: ۱۷ (ترجمہ) جب تم نے (اے پیغمبر) ان پر مٹی پھینکی تھی تو وہ تم نے نہیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

۷- بخاری: ۶۵۰۲۔ پوری حدیث اس طرح ہے:

قال رسول اللہ ﷺ: ان اللہ قال: من عادی لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب، وما تقرب الیّ عبدی بشئی احب الیّ مما افترضت علیہ، وما یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احبہ، فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یستمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی یمشی بہا، وان سالنی لأُعطینہ ولئن

استعاذنی لأُعیذنّہ وما ترددت عن شئی انا فاعلہ تردُّدِی عن نفس المومن یکرہ الموت وانا اکرہ مساءتہ۔

ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالی فرماتا ہے کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی، اسے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ اور میرا بندہ جن جن عبادتوں سے میرا قرب حاصل کرتا ہے اور کوئی عبادت مجھ کو اس سے زیادہ پسند نہیں ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔ (یعنی فرائض مجھ کو سب سے زیادہ پسند ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوۃ، حج) اور میرا بندہ فرض ادا کرنے کے بعد نفل عبادتیں کر کے مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں۔ اگر وہ کسی دشمن یا شیطان سے میری پناہ کا طالب ہوتا ہے تو میں اسے محفوظ رکھتا ہو۔ اور میں جو کام کرنا چاہتا ہوں، اس میں مجھے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا کہ مجھے مومن بندے کی جان نکالنے میں ہوتا ہے، وہ تو موت کو بہ وجہ تکلیف جسمانی کے پسند نہیں کرتا اور مجھ کو بھی اسے تکلیف دینا برا لگتا ہے۔

۸- البقرۃ: ۱۱۵۔ (ترجمہ) جس طرف بھی تم رخ کرو گے، وہیں اللہ کا رخ ہے۔

۹- الحج: ۱۴۔ (ترجمہ) یقیناً اللہ ہر وہ کام کرتا ہے جس کا ارادہ کر لیتا ہے۔

۱۰- الاحزاب: ۷۲۔ (ترجمہ) ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کا بوجھ اٹھا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ظالم، بڑا نادان ہے۔

۱۱- تلاشِ بسیار کے باوجود مکتوب میں مذکور حدیث نہیں مل سکی، نہ اس کا لفظ ملا اور نہ اس مفہوم کی کوئی دوسری حدیث ملی۔

۱۲- السلسلۃ الصحیحۃ: ۱۳۸۷

۱۳، ۱۴، ۱۵: یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے، بلکہ بعض محدثین نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

دیلمی نے اپنی مسند میں حضرت انس سے اور ابن حبان نے حضرت ابوہریرہ سے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۱۶- البقرہ: ۱۴۴۔ (ترجمہ) اپنا رخ مسجد حرام کی سمت کرلو۔

۱۷- صحیح بخاری: ۲۴۰۹۔ (ترجمہ) تم میں سے ہر فرد ایک طرح کا حاکم ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہوگا۔

۱۸- النسا: ۵۹۔ (ترجمہ) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو اور تم میں سے جو لوگ صاحبِ اختیار ہوں، ان کی بھی۔

۱۹- الاحزاب: ۴۔ (ترجمہ) اور اللہ وہی بات کہتا ہے جو حق ہو اور وہی صحیح راستہ بتلاتا ہے۔

۲۰- الکہف: ۲۴۔ (ترجمہ) اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرلو۔

۲۱- الذاریات: ۲۱۔ (ترجمہ) اور خود تمھارے اپنے وجود میں بھی، کیا پھر بھی تمھیں دکھائی نہیں دیتا۔

۲۲- القصص: ۸۸۔ (ترجمہ) ہر چیز فنا ہونے والی ہے، سوائے اللہ کی ذات کے۔

۲۳- بعض صوفیا نے اسے بہ طور حدیث قدسی بیان کیا ہے مگر یہ الفاظ متون حدیث میں نہیں ملے۔

۲۴- الضحیٰ: ۱۰۔ (ترجمہ) اور جو سوال کرنے والا ہو، اسے جھڑکنا نہیں۔

۲۵- بنی اسرائیل: ۸۵۔ (ترجمہ) کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے۔

۲۶- ترمذی: ۲۳۵۲۔ (ترجمہ) یا اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں وفات دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے زمرے میں اٹھا۔

۲۷- اہل تشیع کی کتاب بحار الانوار میں اسے بہ طور حدیث ذکر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کہیں اور یہ الفاظ نہیں ملے۔

۲۸- ابن ماجہ: ۶۳

۲۹- مستدرک الحاکم: ۷۶۳۸

۳۰- ابن ماجہ: ۴۲۵۰۔ (ترجمہ) گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص طرح (ہوجاتا) ہے جس کا کوئی گناہ نہیں۔

۳۱- ہود: ۱۱۴۔ (ترجمہ) یقیناً نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

۳۲- البقرۃ:۳۰۔(ترجمہ) کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے اور خون خرابہ کرے، حالاں کہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد وتقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ نے کہا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔
۳۳- مکتوب میں مذکور الفاظ کو بہت سے لوگ بہ طور حدیث پیش کرتے ہیں مگر یہ الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: ہو غیر ثابت۔ ملا علی قاری نے لکھا ہے: ہو من کلام الصوفیۃ۔ حدیث میں موتوا کی بجاے توبوا الی اللّٰہ کا لفظ آیا ہے۔ عن جابر بن عبداللّٰہ قال: خطبنا رسول اللّٰہ ﷺ فقال ایہا الناس توبوا الی اللّٰہ ان تموتوا۔ [ابن ماجہ:۱۰۸۱] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا تو ارشاد فرمایا: لوگو! مرنے سے پہلے پہلے اللہ کے سامنے توبہ کرلو۔
۳۴- جو شخص چاہتا ہے کہ ایسے مردے کو دیکھے جو زمین پر چلتا پھرتا ہو تو وہ قحافہ کے بیٹے [ابوبکر] کو دیکھ لے۔
۳۵- (ترجمہ) بندہ جب کھڑا ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالی کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔
کشف الاستار میں یہ حدیث حضرت ابوہریرہ سے اس طرح منقول ہے: قال رسول اللّٰہ ﷺ ان العبد اذا قام الی الصلوۃ قائما ہو بین یدی الرحمن۔ بعض روایات میں بین یدی الرحمن کی جگہ بین عینی الرحمن کا لفظ آیا ہے۔ اس حدیث کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [۵۵۳]
۳۶- صحیح بخاری:۱۹۰۹۔ (ترجمہ) چاند دیکھ کر روزہ شروع کرو اور چاند دیکھ روزہ موقوف کرو۔
۳۷- (ترجمہ) اے اللہ کے رسول! عقل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: عقل کا کم تر درجہ ترکِ دنیا ہے۔
کوشش کے باوجود حدیث کے الفاظ یا اس مفہوم کی کوئی حدیث نہیں مل سکی۔
۳۸- (ترجمہ) میرا اللہ کے ساتھ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ جس میں نہ کوئی ملک مقرب دخل انداز ہوسکتا ہے اور نہ نبی مرسل۔
اہل تصوف اسے بہ طور حدیث بیان کرتے ہیں، مگر بعض محدثین نے اس پر لا اصل لہ کا حکم

لگایا ہے۔رسالۃالقشیری میں یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

لی وقت لا یسعنی فیہ غیر ربی۔

۳۹- النجم: ۷، ۸، ۹۔ (ترجمہ) جب کہ وہ بلند افق پر تھا۔ پھر وہ قریب آیا اور جھک پڑا، یہاں تک کہ وہ دو کمان کے فاصلے کے برابر قریب آ گیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک۔

۴۰- ہود: ۱۲۳۔ (ترجمہ) اسی کی طرف سارے معاملات لوٹائے جائیں گے۔

۴۱- (ترجمہ) اگر آپ نہ ہوتے تو میں اپنا رب ہونا ظاہر نہ کرتا۔

یہ حدیث نہیں ہے۔صوفیا کے ملفوظات میں یہ قول ملتا ہے۔

• • •

کتابیات

- البدائع [ترجمہ] — شیخ ابوالغوث گرم دیوان
- بحر زخار — شیخ وجیہ الدین اشرف
- تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیاے جون پور — سید اقبال احمد جون پوری
- تاریخ مشائخ الہ آباد — محمد نظام الدین
- تراجم علماے حدیث ہند — ابویحییٰ امام خان نوشہروی
- تذکرہ علماے اعظم گڑھ — مولانا حبیب الرحمان اعظمی
- تذکرہ علماے مبارک پور — قاضی اطہر مبارک پوری
- تذکرہ علماے ہند — رحمان علی
- تذکرہ مشاہیر ادب شیخ پورہ — ابوالکلام رحمانی
- تذکرہ مشائخ شیراز ہند — میاں محمد سعید
- تذکرہ مشائخ غازی پور — عبیدالرحمان صدیقی
- جواہرات فرنگی محل — مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلّی
- دیار پورب میں علم اور علما — قاضی اطہر مبارک پوری
- سروِ آزاد — میر غلام علی آزاد بلگرامی
- عمل صالح الموسوم بہ شاہ جہاں نامہ — محمد صالح کنبوہ
- مآثر الامرا — نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خان
- مکاتیب امیر مینائی — مولوی احسن اللہ خان ثاقب
- مناقب غوثی [قلمی] — شیخ شمس الدین حیدری
- منتخب اللباب [ترجمہ] — ہاشم علی خان (خافی خان نظام الملک)
- نزہۃ الخواطر — مولانا عبدالحئی حسنی
- ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ

Shaikh Abulgaus Gram Deewan Bhirvi

Hayat o Maktoobat

Mohammad Arfat Ejaz Azmi

شیخ ابوالغوث گرم دیوان کا تذکرہ اگرچہ مختلف کتب ورسائل میں اختصار سے سہی موجود ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی عظمت وبلندی اور علوے کمال وقبولیت کے لحاظ سے ایک وقیع اور قابل ذکر مقالہ کی ضرورت تھی، جس میں دکھایا جائے کہ ان کی شخصیت کس درجہ بلند رتبہ تھی، وہ کس پایہ کے عالم و فاضل اور عامل ومرشد تھے، ان سے دین وملت کو کس قدر فیض پہنچا اور ان کے احوال وآثار کیا ہیں۔

حضرت شیخ ابوالغوث گرم دیوان کی سیرت وشخصیت کا تحقیقی مطالعہ اور ان کی سوانح کے دستیاب لیکن منتشر ماخذ سے ان کی شخصیت اور علم وعمل کی مرقع آرائی ایک مشکل کام تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے ایک عالم و فاضل اور محقق ومصنف کے ساتھ عالی حوصلہ اہل قلم کی ضرورت تھی، تاکہ وہ موضوع کا حق کما حقہ ادا کر سکے۔

عزیز گرامی مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی سلمہ کو اللہ تعالیٰ نے ان اوصاف وامتیازات سے سرفراز کیا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع وعمیق ہے، وہ جویاے علم وتحقیق تو ہیں ہی، تلاش وتفحص اور خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو میں نئی نسل کے وہ ایک ممتاز اہل قلم ہیں۔ علمی وتحقیقی کام کرنا اور ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرنا اور موضوعِ تحقیق وتصنیف سے صدفی صد انصاف کرنے کا عزم ان کی ذاتی خوبیاں اور تصنیفی اوصاف ہیں۔ وہ تصنیف وتالیف کے فن سے بخوبی آشنا ہیں۔ ایک فاضل ویگانہ عالم دین حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ صاحب کی اولاد ہونے کے باوصف وہ بلند اخلاق اور عالی حوصلہ جذبات واحساسات کے حامل ہیں۔ سنجیدگی، متانت ودیانت ان کے دیگر اوصاف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس موضوع کو نبھانے میں کامیاب رہے اور بڑا شاندار تحقیقی اور سوانحی مقالہ لکھا ہے۔

اس مقالہ میں انھوں نے تحقیق وتنقید کا بڑا خیال رکھا ہے اور بڑی خوبی سے حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے حالات وواقعات، سیرت وشخصیت اور فضل وکمال کی مرقع آرائی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے بڑی عرق ریزی سے یہ سوانح عمری تیار کی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرکزی پبلیکیشنز
MARKAZI PUBLICATIONS
S-17/4, Jogabai Ext. Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Mob. 9811794822 / 21, E-mail: markazipublication@gmail.com

ISBN 81-962097-2-X
9 788196 209728